

ڈاکٹر سلیم اختر

آدمی رات کی مخلوق

(افسانے)

<http://www.pakistanconnections.com/ebooks>



آدھی رات کی مخلوق

(افسانے)

ڈاکٹر سلیم اختر

تیرھواں برج

سلیم اختر نے اپنے تعارف میں لکھا ہے کہ عمر بھر خواب کا ایک نسوانی پیکر ان کی زندگی پر حاوی رہا، نہ اعصاب اسے فراموش کر پائے اور نہ ہی اس کے بغیر تکمیل وجود ممکن ہو سکی۔

یہ نسوانی پیکر اختر شیرانی کی ریحانہ و شہناز و سلمیٰ تو تھا نہیں کہ سپنوں کی وادی سے نکل کر ندی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھتا یا مرغزاروں سے ٹہلنے لگتا، نہ ہی یہ لکھنوالے مصحفی و جرات و آتش کی محبوبہ تھی کہ غرنے کی جالیوں سے لپٹی نظر آتی یا مابین سرو و سمن اپنا دوپٹہ پھڑکاتی پھرتی، یہ سحرالبیان کی بے نظیر و نجم النساء بھی نہیں تھی کہ زور و وحشت میں دیوانگی و دانش کے انتہائی راستے پر چلتی، یہ گل بکاؤلی بھی نہیں تھی کہ بار بار جنم لینے کی اذیت اور مسرت سے دو چار ہوتی، یہ زہر عشق کی وفا شعار اور زمانہ شناس نیک بی بی بھی نہیں تھی کہ بعد از وصال عاشق کو دنیا داری کا درس دیتی، یہ بھاؤ بتانے والی اور مجرا بجالانے والی شعلہ جوا بھی نہیں تھی کہ دامن دل آگ پکڑتا اور سب سے بڑھ کر یہ عقیقہ و نیک پروین بھی نہیں تھی کہ خاوند کی ناسپاس محبت کے عوض رو رو کر عالم تنہائی میں اپنا تکیہ بھگوتی اور پھر ایک دن اس کے باورچی خانے کا چولہا پھٹ جاتا۔

سلیم اختر نے اپنی زندگی کا سفر بتدریج طے کیا تھا اور یہ سفر ایک نیم ترقی پذیر سماج کے نچلے متوسط طبقے کے ان لوگوں کا سفر تھا جنہیں عرف عام میں ”عوام“ کہتے ہیں۔ اس سفر کے حاتم طائی اور منیر شامی کو ”حسن بانو“ کے شربت دیدار سے زیادہ دو وقت کی روٹی کی فکر تھی اور اس روٹی کے عقب میں ایک اور طرز کی بھوک اور پیاس کا عفریت ان کا پیچھا کر رہا تھا۔

سلیم اختر کے افسانوں کے مرد و زن کی تربیت قصہ چہار درویش کے مجہول، جنس زدہ، آدم گزیدہ، مفعول مردوں اور اپنے ملازموں کی وقتی کشش میں پھسل جانے والی عورتوں نے کی تھی۔ چنانچہ ان کرداروں کی اس سماجی مجہولیت میں فسانہ عجائب کا کرشمہ یا معجزہ تلاش کرنا ایک طرز کی رائیگانی ہوگی۔

زمانہ طالب علمی سے سلیم اختر کا رجحان نفسیاتی انسانی اور اس سے پیدا ہونے والے الجھاؤں کی طرف رہا ہے۔ وہ فرائد، یونگ

اور ایڈلر کے بنیادی نظریات سے متفق ہیں۔ ان کے افسانوں میں جنس، اجتماعی لاشعور اور انسانی احساس کمتری کے بہت سے مظاہر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اردو ادب کا استاد ہونے کی حیثیت سے شعر و ادب کی تمام اصناف سے ان کی واقفیت ان کے افسانوں کا خام مواد ثابت ہوئی ہے۔ سعادت حسن منٹو اور غلام عباس کے افسانوں کی جنس پرستی سے متاثر ہونے والے سلیم اختر کے اپنے افسانے جنسی افسانے کم اور نفسی افسانے زیادہ ہیں۔ نہ تو ان کے اسلوب میں منٹو، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم اور اسی قبیل کے دوسرے سنسنی خیز افسانے لکھنے والوں کا چٹخارہ ہے نہ ہی وہ نیاز فتح پوری کی نسوانی جمالیات کے انسائیکلو پیڈیا سے فائدہ اٹھانے کے چکر میں ہیں۔ اسی طرح یہ افسانے ایک وقوعہ کی نارمل سی ایف آئی آر بن گئے ہیں جو مصنف کے بیان کے مطابق آہستہ آہستہ ارتقائی منزل طے کرتا ہے اور آخر کار کسی منطقی انجام پر پہنچ کر تحلیل ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی پھول بتا شے نہ کوئی دھوم دھڑکا، بعض افسانے مصنف کی تفصیلات فراہم کرنے کی عادت کے باعث کئی مقامات پر عدم دلچسپی کی سرحد پر جا کھڑے ہوتے ہیں اور قاری اس حجرہ ہشت بلا سے جلد از جلد اپنی برآمدگی چاہتا ہے۔

ان افسانوں سے مجموعی اعتبار سے جس عورت کا ہیوٹا اکٹھا کیا جاسکتا ہے وہ اک دشت بے اماں ہے جس کی جستجو اعصابی اینٹھن کے علاوہ کچھ عطا نہیں کرتی۔ شاید ہمارا افسانہ نگار خواتین کی ہمسائیگی میں رہا ہو لیکن یہ ہمسائیگی احوال و آثار کے تذکرے سے زیادہ نہیں، یہاں وہ عورت بھی مفقود ہے جو محبت یا جنس کے اساسی پہلو کو ابھار کر منٹو کی می یا موزیل کی طرح ترفع کے مدارج طے کرتی ہے۔

اپنے تصوراتی نسوانی پیکر کی تشکیل کے ضمن میں سلیم اختر یونگ کے اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہر مرد میں عورت کا ایک ازلی تصور ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن یہ گوشت پوست کی مخصوص عورت کا تصور نہیں بلکہ اس کی حیثیت جداگانہ ہے۔ عورت کا تصور مرد واحد نہیں بلکہ بہت سے مردوں پر مشتمل ہے اور جمع کا صیغہ رکھتا ہے، جبکہ مردوں کی صورت میں یہ تصورات صرف واحد عورت سے مخصوص ہوتے ہیں، کیونکہ یہ تصور لاشعور کا مرہون منت ہے اس لئے لاشعوری طور پر محبوب ہستی کو بھی اسی تصور میں رنگ دیا جاتا ہے اور پھر جوش محبت میں نفرت کی تشکیل میں اس کا کردار اساسی حیثیت رکھتا ہے۔

سلیم اختر کی یہ واحد مخصوص عورت ان کے افسانوں میں بہت حد تک اپنی چہرہ نمائی سے باز رہی ہے اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمارا افسانہ نگار اپنے آپ کو مادرانہ سربراہی کے پر تحفظ نظام سے آزاد نہیں کرا سکا۔ اس مادرانہ تصور کے پھیلاؤ کے نفسیاتی اثرات کی پہلی کڑی سلیم اختر کا طویل افسانہ ”ضبط کی دیوار“ ہے جسے اس نے دیوار کے اس پار بسنے والوں سے معنون کیا ہے اسی کہانی سے

مصنف کے ہاں مادرانہ جبر اور فردی سطح پر جنسی انقباض کے جذبات جڑ پکڑتے ہیں۔

اس کہانی کے حاجی محمد اشرف صدیقی، ان کے بیٹے ارشد اور سٹوڈنٹس کنسیشن (Concession) دینے والی طوائف کے مابین کیا رشتہ ہے؟ مصنف نے از خود اسے دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی، کون جانتا ہے کہ ارشد کو بیٹا کہہ کر پکارنے والی انہی دو بدنام گھرانوں کی ایک عورت ہو جس کے ناپاک وجود سے حاجی صاحب محلہ کو پاک کرنے کے بعد اپنی تبلیغی جماعت سمیت راہ چلتوں سے صحیح کلمہ سننے کی مہم پر مامور ہوئے تھے۔ اکبر سلیم اور انارکلی کی یہ جنسی مثلث ”ضبط کی دیوار“ کی نفسی مثلث ہے جس کے اختتام پر ارشد کنڈی کھول کر بگٹ بھاگا جا رہا ہے۔

باپ کے گناہ ماں کی عدم محفوظیت، فرد کے ذاتی الجھاؤ اور سماجی سطح پر عدم تسلیمت کے احساسات نے ”مٹھی بھر سانپ“ کے افسانوں میں جنسی سردمہری، جنسی بے زاری، جنسی تشدد، جنسی بے بسی اور ہم جنسیت کے تصورات کو ابھارا ہے۔

ان افسانوں کے آغاز میں سلیم اختر نے لکھا ہے کہ ”میرے بعض افسانوں میں جو عجیب و غریب عورتیں یا ان کی بعید از فہم حرکات ملتی ہیں یہ ماضی کی بازگشت ہیں، معلوم نہیں مجھ میں کیا خرابی ہے کہ بالعموم انبار مل عورتیں ہی مجھ سے آنکراتی ہیں حالانکہ میں بڑا بیبا قسم کا شخص ہوں (اور ایسا ہی رہنا چاہتا ہوں) یہی نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی میرے عمومی طرز عمل کو زن گریزی پر مبنی قرار دیا جاسکتا ہے نہ خوش گفتار ہوں نہ لطیفہ گو نہ باتونی لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں اور کیسے نیوراتی عورتیں مجھے اپنا آئینہ جان لیتی ہیں۔“

مصنف کے خواب کی عورت سے اس کی نیوراتی عورتوں تک سانس لیتی روزمرہ زندگی کا ایک وسیع کاروبار پھیلا ہے، خواب کی عورت وہ عافیت کدہ ہے جو مصنف کی شخصی کمزوریوں اور شخصی اوصاف پر نہ بحث مباحثہ کر سکتی ہے نہ کسی رد عمل کا اظہار، ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں مرد و زن کے بنیادی تعلقات کو شک کی نگاہ سے دیکھ کر ان پر گنہ گاری کی قدغن بھی لگائی جائے اور پھر انہی تعلقات کو سوسائٹی کے چند ایک نامزد (Norms) کے مطابق سب سے بہترین تعلقات بھی کہا جائے، فرد کی نفسیات کا تقسیم ہونا ضروری امر ہے۔ یوں سمجھئے سلیم اختر اسی تقسیم کاری کے دھانے پر کھڑے ہیں، خواب کی عورت کو تسلیم کرتے اور باقی عورتوں کو دھتکارتے ہوئے اپنے ظاہری بدن کی ساری صلاحیتوں کو کشش ثقل کے خلاف استعمال کرتے اور اپنے اندر ہی اندر دھتکتے ہوئے ظاہر ہے اس یک طرفہ کارروائی سے ایک نیوراتی بزدلی کے علاوہ کچھ پیدا نہیں ہو سکتا، یہ نیوراتی بزدلی سلیم اختر کے ہیرو کا مقدر ہے۔

نیوراتی خواتین کی ان کی زندگی میں موجودگی سے ان کے قاری کو کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے، بطور افسانہ نگار وہ عورتوں کی زندگی کے ہیرو نہیں، ان کی حیثیت خاتون کا اپنی لاگ سننے والے آئینے کی سی ہے، یا ایک نیک طبع، پارسا، کمزور ہمسائے کی، جس سے

کوئی عورت خاندانی معاملات کی ناچاقی بیان کر کے تھوڑی دیر کے لئے ہلکی سی مشورہ نما ہمدردی وصول کر سکتی ہے۔ کہانی سننے اور واقعہ دیکھنے کے تجربات سے ہی سلیم اختر نے اپنے افسانوں کا تانہ بانہ بنا ہے اور کہانی کے واحد متکلم کے طور پر اپنی موجودگی کے باوجود افسانے میں وہ Roll of Other ادا کرتے ہی دکھائی دیتے ہیں۔

”مٹھی بھر سانپ“ کے مردوزن کی سماجی اپنا رملٹی کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمارا پہلا تعارف مس احمد بی اے بی ٹی سے ہوتا ہے جو اپنے والدین کی ناخوشگوار ازدواجی زندگی کے معمولات، اپنی بد صورت بھابیوں کی نسل کشی اور بے مہر بھائیوں کی محبت سے اکتائی ہوئی ایک ایسی عورت ہے جو خارجی سطح پر نارمل زندگی گزارنے کی متمنی نہیں۔ بقول اس کے مرد کی نفرت اور ہسٹریا اے اس کی ماں سے ورثے میں ملا ہے اب اس ورثے کے ساتھ کچھ انسانی فطری ضروریات کا جبر بھی اپنی کارفرمائی میں مبتلا ہے چنانچہ توجہ طلبی اور چاہے جانے کے حسیت مس احمد کو سکول کی لڑکیوں اور استانیوں سے جسمانی و مکالماتی راہ و رسم پر اکساتی ہے یہی اس کا راستہ ہے اور یہی اس کی قسمت کہ وہ ایک برگ و بار جزیرے کی طرح بے وصل اور عدم استقبال کی زندگی کے امتلاء میں مبتلا رہے اس راہ پر چلنے اور زندہ رہنے کا جواز پیدا کرنے کے لئے اس نے اپنے آپ کو ڈائری اور ایک خطوں والی صندوقچی میں محفوظ کر لیا ہے وہ سکول لائبریری کی انچارج ہے اور ہیڈ منٹن ٹیم اس کی محنت سے ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ جیت چکی ہے۔

”بجھر مرد اور زرخیز عورتیں“ انسانی مفاہمت، ظاہر خاندانی نظام اور جنسی پیچیدگی کی وہ کہانی ہے جس کا ہیرو جسمانی طور پر ناکارہ ہے۔ وہ تنہائی میں کاٹھ کا پتلا ہے اور دوستوں کے درمیان سسپنس ڈائجسٹ، جس کے ہر فقرے سے جنسی اشتہا نکلتی ہے آخر کار اس کی سمجھ دار و فاشعار جہاں دیدہ بیوی معاشی و معاشرتی نظام کی آسودگی اور سماجی کھسر پھسر کے زیر اہتمام اپنی ایک استانی بطور سوت بیاہلاتی ہے دونوں مثالی عورتیں ہیں۔ خدمت اور محبت میں بے مثل، بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ایک بستر پر سوتی ہیں اور کہانی کا ہیرو سارا سارا دن دوستوں میں گھبراتا رات بھر میں پڑھے ہوئے ناولوں کے واقعات حسب توفیق ذاتی رنگ آمیزی کے بعد انہیں سناتا رہتا ہے گویا کوئی جیمز بانڈ ہے۔

یہ سادیت پسندی ماحول کے جبر کا نتیجہ ہے یا کیمیکل ریکش کا جسمانی نا طاقی کا اعتراف ہے یا جنس مخالف کی جانب سے دھتکارے جانے کی تکلیف کا جسمانی ضرورت کی بے بسی کا اظہار ہے یا انسانی مفاہمتوں کی کہانی۔ سلیم اختر نے غیر جانبداری سے واقعہ نگاری کے بعد نتیجہ کاری کا بوجھ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ تاہم منٹو کی ”ہٹک“ کا یہ مثبت پہلو نفسیاتی حربہ ان کے کئی افسانوں میں ظاہر ہوا ہے ہری ہری گھاس کھانے والی گھوڑی پر برستے ہوئے چھانٹنے انسانی نارسائی کی دکھ بھری کہانی کہتے ہیں۔

ہمارے افسانہ نگار کے گرد جو سماجی نظام پھیلا ہوا ہے وہ معاشی آسائش، خاندانی اقدار، جاگیر دار ہٹ بازی اور سرمایہ دارانہ تعیش کا نظام نہیں۔ یہ تو ان لوگوں کی کہانیاں ہیں جو غربت اور تعلق داری کی جبریت تلے پیدا ہوئے اور سبزہ نودمیدہ کی طرح سراٹھاتے ہی پامال ہو گئے۔ ان کے چہرے چمک سے، جیسے مال و زر سے، بدن قوت نمو سے اور دل خالص محبت سے خالی ہیں۔ اس طرح سلیم اختر کا ہیرو مجموعی طور پر ایک مفلوک الحال سفید پوش، نفس پر ضرورت سے زیادہ جبر کرنے والا اور نفس پر ہی ضرورت سے زیادہ انحصار کرنے والا اسکول ماسٹر یا اسی قبیل کا نیم متوسط کوئی دوسرا درویش بیمار ہے جس کی ظاہر حالات میں کوئی ایسی ادائیں جو قبولیت، ہمدردی اور محبت کے مقام محمود پر پہنچتی ہو وہ بار بار دھتکارے جانے کے عمل سے گزر کر ایک ایسی موضوعیت میں ڈھل گیا ہے کہ لوگ اسے جنس دگر خیال کرتے ہیں۔ صاحب طاقت لوگ جب اسے اپنا ”تختہ مشق“ بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ اس جبریہ عمل کی واقعیت کو اپنے رد عمل سے ایسی استہزائی حالت تک لے آتا ہے کہ ہلکی سی مجرمانہ ہنسی قاری کے ہونٹوں کی لکیر گہر کر دیتی ہے۔

ن م راشد نے ہندوستان کے غلام مسلمانوں کے جذباتی، نفسیاتی، جسمانی، مالیاتی، لسانیاتی، نسلی اور احساساتی جذبات کی کہتری کا بدلہ لینے کے لئے ایک انگریز عورت کی بے حرمتی سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا تھا۔ بالکل اسی طرح کے کمزور لیکن اجتماعی لاشعور کی نفسی حالتوں سے ابھرنے والے انتقام کے شاخصانے سلیم اختر کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ ”تختہ مشق“ کا احمد علی کامران بی اے بی ٹی رقیہ سے جذباتی چھٹکارے کے لئے اس کے بھائی امتیاز سے نتھی ہو جاتا ہے۔ ”خبیث داپتر“ کا پی ٹی ماسٹر کی بد صورت لڑکی کے پھیلائے ہوئے نفسی جال سے نکلنے کے لئے اس کے سوکھے مرل لڑکے کا دھڑن تختہ کر دیتا ہے۔ ”پابندی وقت کے فوائد“ گنوانے والا ماسٹر عنایت جنسی اضطراب کی دہشت سے بچاؤ کے لئے اپنے ہدف اقبال پر چھڑیاں برسا کر لذت و اذیت کے دورویہ جذبات سے گزر کر شانت ہو جاتا ہے۔ ”بار ہواں کھلاڑی“ ہم جنسی نظام کی معمولاتی کہانی ہے جہاں بارہویں کھلاڑی احسان کے نسوانی بشرے پر ٹیم ماسٹر سمیت ہر کھلاڑی دندان آ ز تیز کئے بیٹھا ہے۔ اس پسندیدگی کا اعصابی دباؤ اس قدر ہے کہ ٹیم میچ بار جاتی ہے۔ اب وہ اس کا بدلہ احسان سے لینے کے درپے ہیں سفر سے واپسی پر جب گاڑی پکڑنے کے لئے سب سے اگلی صبح اسٹیشن پر پہنچتے ہیں تو ہر کھلاڑی قصہ شب دو ماہتاب یاد کرتا ہوا ہشاش بشاش نظر آتا ہے اگرچہ ہے تو بار ہواں کھلاڑی۔ شاید وہ پہلے ہی سے جانتا ہے کہ ٹیم میں اس کی شمولیت اس کی یہی داخلی کارگزاری ہے اور اب اس کھیل میں شامل رہنا ہے اور تضحیک کا نشانہ بھی بنتا ہے۔ ”آگ تا پنے کے فوائد“ کا ہیرو ماسٹر بشیر جنسی منافقت کا علمبردار ہے جو اپنی سرد مہری سے چھٹکارے کے لئے اپنے دوست کی بیوی سے ہمکنار ہوتا ہے منہ کا ذائقہ بدلتے ہی اس کی چونچالی واپس آ جاتی ہے اور وہ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے یوں محسوس کرتا ہے گویا لڑائی جیتنے والا کوئی

چیمپئن ہو۔

جنسی جھپٹ کی یہ کہانیاں اضطرابی عمل کی کہانیاں نہیں بلکہ ان کرداروں نے اپنے انتہائی عمل کے وقوع کو بہت دیر پہلے سے اپنے ذہن میں ترتیب دے رکھا ہے اور فوری عمل کے کسی بھی نتیجے کے لئے وہ تیار ہیں، جیسے گدھ جاندار کے مکمل مردار ہونے کا پتہ لگانے کے لئے کچھ دیر لاش پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ان کرداروں نے بھی اپنے شکار پر مناسب وقت صرف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہانی جب اپنے اختتام تک پہنچتی ہے تو اس سے کوئی حیرت برآ مد نہیں ہوتی۔ اس مجموعے کی آخری کہانی ”پاؤں کی جنت“ ہے۔ یہ کہانی مصنف کے نفسیاتی مادرانہ نظام احساس تحفظ اور احساس ملکیت کی علامتی کہانی ہے۔ کہانی کے ہیرو کے اعصاب پر پاؤں سوار ہو چکے ہیں۔ وہ خواب دیکھتا ہے کہ ہاتھی کے پاؤں اس کے جسم کو کچل رہے ہیں اس کی ہڈیاں سرمہ بن گئی ہیں لیکن اس فعل کی گراں باری جسمانی اور روحانی نشاط مدہوشی کا باعث ہے۔ وقتی طور پر وہ اعصابی دہشت محسوس کرتا ہے اور پھر یہ خواب ایک نفسی مسرت کے باعث اس کا معمول بن جاتے ہیں۔ وہ جب بھی لوگوں کا جائزہ لینے لگتا ہے اس کی پہلی نظر پیروں سے الجھ جاتی ہے۔ فارغ اوقات میں وہ بس سناپ پر کھڑا عورتوں کے پیر دیکھتا رہتا ہے۔ اسی سلسلہ خیال کے دوران اسے اپنی ماں یاد آتی ہے جو فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پاؤں چکاتی تھی اس کا باپ ایک سخت گیر آدمی تھا جس کی مستقل موجودگی خوف اور دہشت پیدا کرتی تھی۔ چنانچہ وہ ماں کی طرف کھینچتا چلا گیا، پھر اچانک ماں کے پاؤں سو جتنا شروع ہوئے، ورم بڑھتا گیا، تب ڈاکٹر سے پتہ چلا یہ ”فیل پا“ ہے۔ وہ کبھی گرم پانی سے ماں کی پنڈلیوں اور پاؤں کو لکھو کرتا، کبھی انہیں سہلاتا، کبھی مالش کرتا، غیر ماں کے پاؤں تلے جنت تلاش کرتا۔ میٹرک میں ڈرائنگ کی کاپی پر وہ ہمہ وقت پاؤں بناتا رہتا، بلکہ ایک مرتبہ جب ماسٹر نے زندگی کے نصب العین پر مضمون لکھنے کو کہا تو اس نے جوتوں کی دکان کھولنے کا ارادہ کیا۔

عہد جوانی میں جب اس کے دوست حسن نسوانی کے گن گاتے تو وہ عورتوں کے پیروں کا تذکرہ کرتا رہتا۔

اسی پیروں سے سبھی ہوئی اس کی دنیائے ذاتی میں ایک عورت کے پاؤں اس کے لئے جنسی بلاوے کا باعث بنے۔ وہ اس کے ہمراہ اس کے کمرے تک آئی اور مکمل رضامندی کے طور پر اپنے کپڑے علیحدہ کرنے لگی۔ ہمارے ہیرو نے پوری عورت پر توجہ دینے کی بجائے اس کے سینڈل اتارے اور اس کے پیروں کو دیوانہ وار چومنے لگا، اس کے باپ کا تشدد رہن سہن اور اس کی ماں کی مکمل اطاعت گزاری جس جنسی انتہا کا باعث بنی تھی ایک بازاری عورت کے پاؤں اس کا انخلائی مسیح ثابت ہوئے تھے۔ پابوسی کا یہ نفسیاتی مظہر ماں کے وجود کے تحفظ کی وہ نخست مثال ہے جس نے اسے باپ کی سرمد مہری سے محفوظ رکھا، یہ پاؤں اس کا احساس ملکیت

بھی تھے اور سلسلہ ارتکا زبھی آخر کار یہی پاؤں اس کی نارمل زندگی کا نقطہ آغاز ثابت ہوئے۔

سلیم اختر نے ”مٹھی بھر سانپ“ ایڈی پس کے نام انتساب کئے ہیں۔ ان افسانوں میں ماں، بیٹا، باپ، ماں، بہو، بیٹی، سہیلیاں اور عاشق، ملازمہ، مالکن اور عاشق کی نفسی تثلیث بنیادی طور پر مصنف کے مادرانہ نظام کی اجتماعی تمثیل ہے جس کے عقب میں بچپن کے ابتدائی ایام کی جسمانی وابستگی اور جنس غیر سے لاشعوری رقابت کا احساس چھپا بیٹھا ہے۔

سلیم اختر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ”کڑوے بادام“ ہے جہاں مصنف نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ خواب کی عورت اور زندگی میں ملنے والی عورتوں کا جب بھی مقابلہ کرتا ہے تو اسے عام زندگی کی عورتیں ہیج، ونگر اور بھیا تک لگتی ہیں، وہ مارے کراہت کے پیچھے ہٹ جاتا ہے، انکی آوازوں کی کرخنگی، جسم کی بدبو، نگاہوں کی مکاری اور مصنوعی پن ان کی بدنیتی اسے بیزار کر دیتی ہے، یہ رویہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ وہ اچھا خاصا زن بیزار بن چکا ہے، بہت عرصے تک وہ شادی کے خیال سے الگ رہا پھر اسی لاشعوری نے اسے نفسیاتی مضامین اور جنسی افسانے لکھنے میں مدد دی۔ اس بیان کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر مصنف کی تحلیل نفسی کی بجائے تو شاید خواتین کی جانب سے کسی ابتدائی دل زدگی کا کوئی واقعہ دھیان پڑے، لیکن ہم یہاں افسانہ نگار کی ذاتی ناکام محبت سے زیادہ اس ہولناکی سے دلچسپی رکھتے ہیں جسے انہوں نے عورتوں سے منسوب کیا ہے، میر نے کہا تھا۔

زور و زر کچھ نہ تھا بارے میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

میر درد بولے۔

سیمیں تنوں کا ملنا چاہے ہے کچھ تمول
شاہد پرستیوں کو ہم پاس زر کہاں ہے

غالب نے لکھا۔

ہم سے چھوٹا قمار خانہ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

سلیم اختر کے افسانوں کے ہیرو کی سب سے بڑی کمزوری اس کا مفلوک الحال ہونا ہے، دوسری جانب یہ ہیرو جسمانی تمول اور چہرے بکاش کی زیبائش سے بھی عاری ہے مثلاً ایک افسانے کے علامتی ہیرو کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ وہ نرم جسم والیوں

سے ہمیشہ خوفزدہ رہا کیونکہ اس کا قد چھوٹا تھا وہ منحنی اور کمزور تھا وہ پر اعتماد نہ تھا وہ احساس کمتری کا شکار تھا۔

اسی احساس کمتری نے سلیم اختر کے افسانوں کی عورتوں کو نشاطیہ حسن کے دائرے سے خارج کرتے ہوئے انہیں بد صورت مخلوق میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان افسانوں کی عورتیں عام طور پر سیاہ قام بدہیت بد لباس بد سلیقہ عیار بے زار جنسی اشتہا سے در ماندہ اور حال مست ہیں۔ اگر کہیں کوئی شباہتی حسن نظر بھی آتا ہے تو اسے کرداری منافقت اور چالاکی ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ شاید گناہ آدم اور اس کی سزا کی موجب عورت ابتدا ہی سے مصنف کے ذہن میں کسی گنہ گاری کے درجے پر فائز ہو چکی ہے اور اس کا صرف ایک ہی پہلو اسے قابل عزت لگتا ہے جس کے لئے ”ماں“ کا رشتہ وضع کیا گیا ہے۔ اس ماں کی موجودگی میں نہ تو وہ بیوی کی رفاقت اور سعادت مندی کا مزا اٹھا سکتا ہے اور نہ محبوبہ کے خنجرے۔ سماجی حد بندیوں اور شاید چند نفسیاتی گروہوں کے توسط سے پیدا ہونے والے اس شخصی انقباض نے سلیم اختر کی عورتوں کو بہت سے مقامات پر کڑوے باداموں میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ عورت کبھی چالیس منٹ کے فرضی قصے کی نارسائی ہے تو کبھی دشت تنہائی کی حجرہ ہشت بلا چنانچہ اپنے نصف بہتر سے کٹ کر سلیم اختر کے ہیر و کو عدم تحفظ انسانی بزدلی اور خوف کے مزید مظاہر سے گزرنا ہے۔ ایسی صورت حال میں مصنف کے کرداروں کو ہم امتلائی حالتوں میں پاتے ہیں۔

”میں اپنے ہی بنائے ہوئے تالاب میں کھڑا تھا۔“ (محاذ 1971ء)

جب اس نے یہ تمام گفتگو اپنی ماں کو سنائی تو وہ نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر صرف ایک لفظ بولی ”نامرد“ (دھرتی کی زنجیر)

”مگر میں بے بس ہوں“ آکٹوپس کا گھیرا مکمل ہو چکا ہے اور اس کے بازو میرے جسم کو جکڑے جیسے خون چوس رہے ہیں۔ میرا

دوسرا وجود باہر پہرے پر ہے اور اندر میں محبوس۔“ (دوسیارے)

”گریز پا“ پابوسی کی ایک بیمار تمثیل ہے جہاں عاشق اپنی محبوبہ کے پاؤں توڑ کر کہتا ہے۔ ”میری نیت نہ تھی میں تمہارے پاؤں

توڑنا نہ چاہتا تھا میں تمہیں ڈرار ہا تھا۔ وہ دوبارہ اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔“

سلیم اختر کے مردانہ کرداروں کی ایک خاص خوبی مذہب سے ان کی ظاہر اور ازل بعد اس کے خلاف شخصی مزاحمت ہے سلیم اختر مذہبی آدمی ہیں لیکن بنیاد پرستی کے خلاف رہے ہیں ان کا افسانہ ”رزق حلال“ اسی شخص اور وقتی ضرورت کا افسانہ ہے جس کے لئے انسان کوئی بھی جواز تلاش کر سکتا ہے۔

اس افسانے کے ہیر و ماسٹر کرم داد دینیات کا استاد ہے۔ کچھڑی داڑھی گھٹا ہوا سر، ٹخنوں سے اونچی میلی شلوار، سر پر رومی ٹوپی، غصے

میں ہو تو داڑھی دانتوں میں دبائے جٹ اور ہاتھ بھاری ایک ہاتھ کے ناخن بڑھے ہوئے تاکہ بوقت غصہ مقابل کے کان کی لودا ہیرٹی

جاسکے ماسٹر کرم داد کا اچھا کھانے اور قسم قسم کی گندی گالیاں دینے کا لپکا ہے۔ وہ مذہبی انتہا پسندی کے اس درجے پر ہے جہاں انگریزی لباس، انگریزی زبان، انگریزی معلومات، انگریزی ایجادات کو کفر کے مرتبے پر رکھ کر دیکھنا عین ثواب ہے۔

یہی ماسٹر کرم داد ریٹائرمنٹ کے بعد دادا صاحب کے بازار میں سیپا رہے بیچ کر رزق حلال کمانا چاہتا ہے اور آخر کار اس میں ناکام رہتا ہے پھر ایک دن مصنف دیکھتا ہے ماسٹر کرم داد بے داغ لباس پہنے آنکھوں میں سرمہ لگائے سفید نورانی داڑھی لئے مہندی رنگ بالوں کا کلہ سجائے کتابوں کی دکان پر سب سے بیٹھے ہیں دور دور تک عطر حنا پھیلی ہے۔ دکان کا سارا فرنیچر فارمیکا کا بنا ہے دیواروں پر مقامات مقدسہ کی تصاویر اور آیات کے طغریں سج رہے ہیں اور ماسٹر صاحب قلمی گانے اور قلمی رسالے بیچ رہے ہیں۔ اس پر ان کا دعویٰ ہے کہ ”میں نے ان سینما والوں کو دکھا دیا ہے کہ گندے ماحول میں خود کو کیسے پاک صاف رکھا جاسکتا ہے۔“

مصنف ان کے اس اصرار پر ہکا بکا رہ جاتا ہے کہ ”ادب بیکار چیز ہے تم لکھو وہ کتابیں جو آنہ لائبریری میں خفیہ طور پر چلتی ہیں۔ اس میں بڑی پیدا ہے۔ کوڑیوں میں چھاپو ہیروں کے مول بیچو۔ مہینہ میں کم از کم ایک کتاب لکھ دیا کرو کم بخت کتنی کیوں نہ چھاپو طلب ہی نہیں ختم ہوتی ان کتابوں کی۔“ ماسٹر کرم داد کے منہ سے اٹھنے والی الاٹچی کی خوشبو پورے افسانے میں پھیل جاتی ہے۔ افسانہ المیہ اور فارس کی آخری حدوں کو چھونے لگتا ہے انسانی منافقت مذہبی عدم مطابقت نظریاتی کمزوری معاشی عدم تقسیم اور شخصی مزاحمت کے طریقہ ہائے کار ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر طویل قہقہے میں ڈھل جاتے ہیں۔

”تو تا کہانی“ بیگم جمال اس کے آئینے اور اس کے توتے کی کہانی دراصل ایک طویل خود کلامی اور خود آگبی کا شاخسانہ ہے۔ ایک جوان عورت کی جسمانی پتلا جس کا شوہر مال کمانے امریکہ سدھار گیا ہے۔ آخر ایک دن بیگم جمال آئینے کی آنکھ اور توتے کے مکالمے کو اپنے دل کی سچی آواز سمجھ کر اپنے ہمسائے دلدار مرزا سے منسلک ہو جاتی ہے جس کی وجہ شہرت اچھی نہیں۔

سلیم اختر کی تجریدی کہانیوں پر کافکا کے افسانوں اور اساطیری داستانوں کے اثرات ہیں۔ یہاں اپنی اپنی فطری کارکردگی کے باعث جانوروں سے مشابہ ہیں۔ انسانی بستیاں جنگلوں کا روپ دھار چکی ہیں اور مردہ دھار والی مقروض اپنے حصے کا دان چاہتی ہے ناشدنی کی سزا کا دن اترتا ہے۔

مصنف کے نئے افسانوی مجموعے ”آدھی رات کی مخلوق“ میں انسانی منافقت اور انسانی مجبوری نے ایسے سوال اٹھائے ہیں جن کا منطقی جواب صرف خاموشی ہے۔ ”سانتا کلاز کا زوال“ مذہبی خوش فہمی کے اختتام کی کہانی ہے۔ جیسے ماسٹر کرم داد نعوذ باللہ کہتے کہتے آنہ لائبریری کا مالک بن بیٹھا تھا اسی طرح سانتا کلاز کے کھلونے اور ٹافیاں اپنی وقعت کھو چکے ہیں۔ اجتماعی آبروریزی سے جنم لینے

والے بچے اس سے یسوع مسیح کے نہیں اپنے حقیقی باپ کے طلبگار ہیں، جشن کرمس کا نجات دہندہ جوزمین پر یسوع مسیح کی تمثیل ہے۔ کہانی کے اختتام پر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور اس پر بچوں کی ٹافیاں اور کھلونے چرانے کی فرد جرم عائد کی گئی ہے۔ جب کسی قوم کا نجات دہندہ مسخرے کا روپ دھار لے تو پھر ایک نئے انقلاب اور نئے عہد نامے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ سلیم اختر نے اپنے افسانوں میں اخلاقی مسیحا بننے کی کوشش نہیں کی اس لئے کسی نظریاتی گرفت کے زیر اثر ان پر کوئی مقراض بھی نہیں چلائی جاسکتی۔ ”کافر“ بھی انسانی بے بسی اور مذہبی جنون کی کہانی ہے، مدو کمہارا اپنے بیٹے کی موت کے بعد اپنے اضطراب اور محبت کو مرکز کرنے کے لئے اپنے چاک پر ایک مورت تراشتا ہے اور اسے بمثل اپنا بیٹا جان کر اس کا نام محمود رکھ دیتا ہے۔ محلے کے مولوی صاحب اس شرک سے متنفر ہیں اس لئے وہ شریعت کے گرز سے اس مورت کو توڑ دیتے ہیں جو مدو کو کافر کے درجے پر لے آئی تھی، مدو دیوانہ ہو کر مر جاتا ہے اور ایک ہی گھر سے دو جنازے اٹھائے جاتے ہیں۔

”لب پہ آتی ہے دعا بن کر“ مصنف کے انہی جذبات کا آئینہ دار ہے جن کی تفصیل اوپر بیان کی گئی، معاشرے کی منافقانہ روش اور اخلاقیاتی رسوم و قیود کی مروجہ صورت حال سے جنم لینے والی عیاری کے مابین نمازیوں میں سے کوئی بھی حقیقی مسلمان بننے کو تیار نہیں، کیونکہ حقیقی مسلمان بننا راجی کا زیاں ہے اس لئے لوگ صرف دعا کے کھیل تماشے سے سروکار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس مجموعے کو دو نفسی کہانیاں ”پاؤں کی جنت“ کی طرح طویل سلسلہ خیال اور نقطہ ارتکاز کی کہانیاں ہیں۔

”آخری تدبیر“ کا شوہر دلی طور پر اپنی بیمار بیوی سے چھٹکارا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ طرح طرح کے بہانے سوچتا ہے جن میں سے کچھ نیک دلی پر بھی محمول کئے جاسکتے ہیں۔ اس کی ذہنی کشمکش سے طرح طرح کے نائٹ میز جنم لیتے ہیں، وہ اپنے خیال کا ارتکاز اس آئینے پر کرتا ہے جو میاں بیوی کے کمرے میں لگا ہوا ہے۔ یہ آئینہ ہی ان کی محبت کی دلیل ہے اور یہ آئینہ ہی اس کی بیوی کے قتل کا شاہد ہے۔

”وہ بیوی کے ساکت جسم سے تکیہ اٹھاتا ہے تو آئینہ اس کے ردبرو ہے۔ وہ گھبرا کے آئینے سے پوچھتا ہے۔ ”تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟“

آئینہ کہتا ہے۔ ”یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے۔“

”سیاہ حاشیہ“ انسانی عیاری کی ایک اور تصویر ہے۔ مصورہ ناز کو سیاہ رنگ بہت پسند ہے، اس کی ساس اسے سیاہ لباس پہننے سے منع کرتی ہے۔ اسی امتناع کے ساتھ ناز کے ہاں ایک نفسیاتی گرہ بندھ جاتی ہے، ناز ایک دن اپنی ساس کی سیزھیوں سے دھکا دے کر مار

دیتی ہے اور پھر سیاہ لباس پہن کر ماتم کی تصویر بن جاتی ہے۔ یہ جرم اس کے لاشعور کا حصہ بن کر اس کی تصویروں میں نمایاں ہوتا ہے اور یہ تصویریں انفرادی قتل کی گواہ بن جاتی ہیں۔

مصنف نے لکھا ہے۔

”ناز کی تصاویر کی نمائش ہے۔ یہ سب سیاہ تھیں، بلیک انک، چار کول، سیاہ مارکر، بلیک آئل پینٹ اور واٹر کالر، اس نے ہر صورت میں سیاہ رنگ استعمال کئے تھے، لینڈ اسکیپ، منجند سیاہ لاوا، پھول سیاہ، لیکٹس، شاخیں کا لے ناگ، بچے کا لے پتھر، عورتیں کالی چٹائیں، دریا پگھلا ہوا کونڈ، ہاتھ درختوں کی سیاہ جڑیں، سیاہ چہروں پر وحشت سے پھٹی آنکھیں۔ حیرت سے ابلی ہوئی آنکھیں، چیختے پھنکارتے ہونٹ، بھنور میں ڈوبتی ہوئی عورت کا مدد کے لئے اٹھا ہوا ہاتھ، کوؤں کے نرغے میں عورت، ہاتھ اور پاؤں پر بھاگتی عورت، عجیب تصاویر تھیں، گویا میت کا آخری دیدار ہے، ایک تصویر دیکھ کر ہم ٹھٹھک گئے، کوٹھے کی سیزھیوں سے سر کے بل گرتی عورت اور پس منظر میں پھیلے ہوئے ہاتھ سے مشابہ سیاہ بادل۔ ہم نے دوبارہ تصویر کو دیکھا۔ ”اوہ تم یہاں ہو“ اس کی آواز پر ہم پلٹے، سیاہ لباس میں لمبوس ناز اپنی نمائش ہی کی ایک تصویر معلوم ہو رہی تھی۔“

”آدھی رات کی مخلوق“ نے مجموعے میں پہلی مرتبہ ہمیں سلیم اختر کے ہاں نسوانی حسن کے اثبات کے کچھ مظاہر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں ”نیک پروین“ کی پابوسی والی خدمتگار عورت ہے جو آخر کار خاور کا دل جیت لیتی ہے۔ ”پریاں قطار اندر قطار“ کی سبز آنکھوں والی سانولی پری ہے جسے ہیر واپنی بوتل میں بند کر کے اپنی الماری میں رکھ دیتا ہے، ایک ایسی الماری جس کی ہر بوتل میں ایک سے ایک بڑھ کر نازنین، مہ جبین، ناز آفرین، گل بدن، صبح کا اجالا، سونے کی آ بشار، سیاہ آنکھوں میں کالا جادو، کمر کے خم میں شاخ گل کی لچک اور حنائی پوروں میں خون جگر لئے ہوئے ہے۔

یہ مردانہ احساس ملکیت کی کہانی ہے جو عورت کو مثل ایک تتلی کے کتابوں میں بند رکھنے پر تلا ہے۔

”گرو دکھشنا“ سلیم اختر کے جنسی، اخلاقیاتی اور جمالیاتی تصورات کا ایک ایسا افسانہ ہے جہاں ہمیں پہلی بار اس خواب کی عورت کا سراپا دکھائی دیتا ہے جس نے دنیا جہان کی عورتوں سے ہمارے افسانے نگار کو متاثر کیا۔ یہ ناری ویشیا ہے۔ گرو کا چیلہ اپنے جسم کا دان اس کی نذر کر کے ہمیشہ کے لئے شانت ہو گیا ہے اب اسے مذہب و ریاضت کے کشت کاٹنے کے لئے کسی منتر کی ضرورت نہیں، محبت کا کٹنا اس کے جسم میں چبھا ہے اور اسی چھن سے اس نے بیچ تنتر اور بیتال کٹھاؤں کا سراغ پالیا ہے، وہ جان گیا ہے کہ ناری بغیر گیان اگیان، تپسیا، بدھی سب بیکار ہے، وہ پچھمن رکھا الا نگ گیا ہے اور اب اس کی بات کی زحمت اٹھانے سے قاصر ہے کہ وہ گرو کو اپنی دکھشنا

کی تفصیلات فراہم کرے یا چپ رہے۔

”موہنی“ بھی ویشیا اور دیوی کے جمالی گنوں کی کہانی ہے۔ ”آدھی رات کی مخلوق“ کی حبشی لڑکی کا حسن، معصومیت اور اعتبار کرنے کی عادت انسانی نیکی کے جذبات جگاتی ہے۔ اس مجموعے کے نسوانی کرداروں سے مصنف کا مشفقانہ سلوک اس کی اندرونی کایا کلپ کی کہانی کہتا ہے، یہاں وہ مادرانہ سایہ عاطفت سے نجات پا کر خالص عورت کے جمالیاتی، مہربان اور سایہ دار آنچل تلے سستانے کو رکا ہے۔ شاید سلیم اختر کی نسوانی روح نے ہم زمیستی کے تجربے میں انہیں مکمل سپردگی کا کوئی لمحہ عطا کیا ہے اور وہ کوئی ظاہر روپ اختیار کر کے ان کے احساس جمال و تحفظ کا محیط ثابت ہوئی ہے۔ بہر حال ان کے یہ افسانے عورت کے نئے اعتبار کی طرف اشارہ دیتے ہیں جو جنسی کج روی اور جنسی ارتقاع کے درمیانی خلل کو دور کرتا ہے۔ مصنف نے تمام عمر جن بد صورت اور بد ہیئت عورتوں سے نفرت کی ہے وہ اس مجموعے کے افسانے ”تیر ہواں برج“ کی پیرہ زن جادوگرنی میں ڈھل گئی ہیں، یہ پیرہ زن سلیم اختر کا نائٹ میئر ہے جو اسے برج ہول میں دوڑائے پھرتا ہے۔ ایسا برج جہاں ریگنے والے کیڑوں کی حکمرانی ہے، بچھوؤں اور گدھوں سے ملاقاتیں ہیں، لہو کی چچھاٹ ہے، شجر سنگبار ہے، بیابانی ہے، اضطراب ہے، عیاریاں اور مصیبتیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا افسانہ نگار کب تک اس تیر ہوئی برج کا اسیر رہتا ہے اور کب اسے اس کے خیال کی سبز پری اپنی سمت آنے کا بلاوا بھیجتی ہے۔



آدھی رات کی مخلوق

Hi, Handsome!

میں نے چونک کر بلکہ بدک کر دیکھا، یہ کون اندھی یا پھر پنگی مجھ سے مخاطب تھی، ہینڈ سم تو کجا میں تو قبول صورت بھی نہ تھا۔

نیویارک سے آئے چھ ماہ ہو چکے تھے اور ابھی تک میں یہاں اجنبی ہی تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس دوران میں نہ تو ہڈن ریورڈا لریور میں تبدیل ہوا اور نہ ہی سنہری زلفوں اور نیلی آنکھوں والیوں میں سے کسی کو اپنا منتظر پایا تھا۔ منتظر کیا، وہاں تو کسی کو میرے وجود کا بھی احساس نہ تھا۔ ہر شخص یوں لاتعلقی سے دیکھتا گویا مجھے نہیں بلکہ میرے آر پار دیکھ رہا ہو اور مسکراہٹ، تھینک یو، آرویلکم سننے کے باوجود بھی ہمیشہ ایک آنچ کی کسر رہ جانے کا احساس ہوتا۔ بسا اوقات میں نیویارک کے کنکریٹ اور نیون سائز کے جنگل میں خود کو گمشدہ اور اسی لئے خوفزدہ خرگوش کی مانند محسوس کرتا۔

Hi, Handsome!

وہ مجھے نظر آتی ہے بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ اس کے رنگ نظر آتے ہیں۔ ریڈ منی شرٹ سکرٹ کے نیچے لمبی آنہوسی ٹانگوں پر ریڈ سٹاکلنز ریڈفل بوٹ، گلے میں موٹے موٹے سرخ منکوں والا ہار، ایسے مسکے جن کے ہار ہمارے مزاروں کے درویش پہنتے ہیں، بازو میں سرخ پرس لڑکی کیا تھی چلتی پھرتی ریڈ بک کا پاکٹ ایڈیشن تھی۔

مجھے متوجہ پا کر سرخ لپ اسٹک سے لتھڑے بھاری ہونٹ مسکراہٹ میں کھل جاتے ہیں تو سفید اور مضبوط دانت لٹکارا مارتے ہیں۔ وہ سر پر آنکھیں جھپکتی نیون سائن کے بدلے رنگوں کی پھوار میں کھڑی گویا نیلے، سرخ اور زرد رنگوں میں بھیگ رہی تھی، ہر رنگ چند لمحات کے لئے اسے اور اس کے سرخ رنگوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا، پھر ان رنگوں کے وقفہ میں اس کے اپنے رنگ کی رات نمایاں ہو جاتی۔ آنکھیں چار ہونے پر وہ بڑے زور و شور سے مسکراتی ہے۔ میں گوگو کے عالم میں ہوں۔ یہ ایسی صورت حال تھی جس سے نمٹنے کے لئے میری تعلیم و تربیت نہ کی گئی تھی۔

Wana Have a Ride?

اس کی آواز ہسکی تھی ایسی آواز جو لومینگ میں ہسکی میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ اب میں سمجھ چکا تھا کہ وہ کون ہے اور مجھ سے کیا

چاہتی ہے۔ ایسی عورت ہی مجھے ہینڈسم کہہ سکتی تھی۔

میں آل نائٹ گیس سٹیشن پر ملازم تھا۔ آٹھ دس گھنٹے تک طرح طرح کے امریکیوں کی کاروباری مسکراہٹ سے خدمت کرتے کرتے ہونٹ ہاتھ ناگلیں سب کچھ اکڑ جاتا لیکن فی گھنٹہ آٹھ ڈالر اجرت اور پچیس پچیس اور پچاس پچاس سینٹ کی ٹپس کی اضافی آمدنی میری پاکستانی اوقات سے بڑھ کر تھی۔ یہ الگ بات کہ گھر میں میں شہزادہ سلیم سے کم نہ تھا۔ محبت اور لاڈ پیار نے مجھے بگاڑ رکھا تھا مگر وہ لاہور تھا اور یہ نیویارک۔ میں نے لاہور میں جو خواب دیکھے تھے نیویارک ان کی تعبیر تھا۔

نیویارک کی رات کی ڈوبتی نبضوں میں میں ڈولتے قدموں سے سب وے کی سیڑھیاں اترتا جاتا، اترتا جاتا، اترتا جاتا۔ حتیٰ کہ میں خود کو نیویارک کے پیٹ میں محسوس کرتا۔ جہاں انتہی کی مانند پھیلی ریلوے لائن کی سرنگ اور جرثوموں جیسے مسافر۔ میں یہاں جب نیا نیا آیا تھا تو یہ سفر بڑا تھرانگ محسوس ہوتا، یہ احساس کہ ہمارے سر پر پورا نیویارک آباد ہے، خلقت رواں دواں ہے اور سکانی سکر پیر سرکشیدہ ہیں، عجب طرح سے حیران کر دیتا۔ میں بچوں جیسی خوشی سے سفر کیا کرتا کہ یہ لاہور کی بے ہنگم سڑکوں اور بے مہارٹر ٹریفک کے تجربات اور مشاہدات کے برعکس تھا۔ ان دنوں میں نووارد تھا یعنی نیویارک نہ بنا تھا اور کسی ٹورسٹ جیسی بے فکری اور دلجمعی سے سارا سارا دن مین ہٹن کی ایک دوسرے کی آئینہ بنی عمارات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ ۴۲ سٹریٹ پر سیکس شاپس اور سیکس شوز کی یا ترا معمولات میں شامل تھی مگر اب نہیں، چند ماہ ہی میں نیویارک نے میرے کس بل نکال دیئے تھے۔

لوہاری کی ایک یرقان زدہ گلی میں، مکینوں سے بھرے ناکافی مکان کی چھت پر بازوؤں کا تکیہ بنائے ستاروں کو گھورتے ہوئے میں نے امریکہ کے نام پر جو خواب دیکھے تھے ان میں اگر ایک طرف میری نا آسودہ جوانی کی تسکین کو میرے بازوؤں پر سنہری زلفیں بکھیر کر نیلی آنکھوں میں محبت کی روح سمیٹ لینے والی لڑکیاں تھیں تو والدین کی خدمت اور چار جوان بہنوں کے جہیز کی ضرورت بھی تھی۔ خاصی رقم خرچ کر کے میں بالآخر امریکہ پہنچ ہی گیا مگر اب سراب میں پیاسے مسافر کی مانند سرگرداں۔ رات کو نیویارک کی تہہ میں لے جاتی سب وے کی سیڑھیاں اترتے وقت بعض اوقات میرے تھکے پاؤں مجھ سے سوالات کرتے، ایسے سوالات جن کے جوابات میرے پاس تھے بھی اور نہیں بھی۔ تاہم آخری جواب ڈالر کے مقابلے میں ہر دم پاکستانی روپے کی گرتی قیمت میں تھا۔

آج بھی روز کی مانند تھکے قدموں سے سب وے کی سیڑھیاں چڑھ کر سڑک پر نکلا تو طبیعت کو کچھ زیادہ ہی اداس پایا۔ میں اپنی اوقات کے مطابق بروکلین میں اپارٹمنٹس پر مشتمل ایک بڑی بلڈنگ کی چھوٹی سی سنگل بیڈ روم بیس منٹ میں مقیم تھا۔ میں لاہور میں چھت سے نالاں تھا لہذا اب بیس منٹ میں رہ رہا تھا۔ جس پاکستانی دوست نے مجھے بلایا تھا، بے کاری کے دنوں میں ساتھ رکھا اور

کھایا پلایا تھا۔ اس کا باپ چل بسا تھا، وہ افراتفری میں جب روتا پینتا گھر پہنچا تو باپ کے قتل بھی ہو چکے تھے۔ اس کا فون آیا تھا اب وہ وہیں گھر کی ذمہ داریاں سنبھالے گا اور یوں بیس منٹ اب میرے پاس تھی۔

نیویارک میں بروکلین غرباء کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ کالوں کے علاوہ پاکستانی، ہندوستانی، بنگلہ دیشی، سپینی، میکسیکین اور غریب یہودی بھی آباد ہیں۔ مین ہٹن پر چمکتا دمکتا چاند بروکلین میں میلا میلا سا دکھائی دیتا ہے۔ رات کو سڑکیں کچھ زیادہ ہی ویران رہتی ہیں، سایوں میں ڈوبی لینز کچھ زیادہ ہی ڈراتی ہیں۔ کالے کچھ زیادہ ہی کالے نظر آتے ہیں اور یہیں اندھیرے کی یہ مخلوق مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

Wana Have a Ride?

اس کے بعد جو کچھ ہوا، بے حد اچانک تھا۔ کسی بی کلاس ایکشن فلم کے منظر کی مانند۔ نیون سائز کے رنگ بدلنے کی مانند، اندھیری لین کی پرچھائیاں جیسے مجسم ہو گئیں، وہ چینی۔

What the Devil?! Hey

میں نے سایہ کو جواب جیسی میں تبدیل ہو چکا تھا اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ پیشتر اس کے کہ میرا ذہن صورت حال کا ادراک کرتا، مکوں نے ڈھیر کر دیا۔ بھاری سانسوں اور پھر تیلے ہاتھوں سے میرا پرس نکالا گیا، جائزہ لیا گیا اور پھر تھوک دینے کی مانند میرے منہ پر مارا گیا۔

دور پولیس کار کے سائرن کی آواز آئی۔ بھاری آواز میں غراہٹ کی مانند ان میں سے کسی ایک نے Shit کہا، تاریک لین میں سے وہ جس طرح سایوں کی مانند نمودار ہوئے تھے اسی طرح سایوں کی مانند تاریک لین میں غائب ہو گئے۔ پولیس کار کا سائرن قریب سے قریب تر ہوا اور پھر دور سے دور تر، غالباً پولیس نے ہمیں نہ دیکھا تھا یا پھر کسی بڑے مجرم کے پیچھے تھی۔ نیویارک میں ملنگ اتنا بڑا جرم نہیں بالخصوص اس وقت جب شکار بچ جائے۔ بلاشبہ میں خوش قسمت تھا کہ بچ گیا ورنہ مکا کی جگہ پیٹ میں چاقو بھی اتر سکتا تھا۔ اس دوران میں جو کاریں گزریں انہوں نے رکنا ضروری نہ سمجھا۔

Are you all right?

وہ مجھ پر جھکی تو چیپ پر فیوم کی تیز خوشبو ناک میں اتر گئی۔ وہ میرا جسم ٹٹول رہی تھی۔ یہ کیا کر رہی ہے، مزید تلاشی لے رہی ہے یا ٹوٹی پسلیاں گن رہی ہے۔

You seem to be ok, Are you?

اس کے لہجہ میں قدرے اطمینان تھا۔

میں کراہ کر اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں وہ اٹھنے میں میری مدد کرتی ہے، میں چکرا کر کھبے کا سہارا لیتا ہوں۔ اس دوران میں جو کاریں گزریں انہوں نے رکنا ضروری نہ سمجھا۔ وہ غصہ میں بولتی ہے۔

The Bastards... The black shits, the...

پھر وہ میری طرف پلٹتی ہے۔

You are ok..... A'nt you...?

میں اثبات میں گردن ہلاتا ہوں اگرچہ پیٹ میں آگ سلگ اٹھی ہے اور گردن پر گومڑ بھی محسوس ہو رہا ہے، مگر خون بہنے کی نوبت نہیں آئی لہذا نیویارک کے معیار کے لحاظ سے میں سستا چھوٹ گیا۔ اگرچہ پے ڈے پر ملی ہفتہ بھر کی محنت مع ٹپس اڑ گئی، تاہم جان بچی۔ وہ میرا بازو پکڑ لیتی ہے۔

Can you walk?

سر چکرا رہا ہے ارنائگیس کانپ رہی ہیں، پھر بھی میں چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک قدم، دو قدم..... پاؤں ڈمگ رہے ہیں مگر چھاتی میں ٹیس نہیں گویا پسلیاں بچ گئیں۔

نیویارک کے معیار کے لحاظ سے میں واقعی خوش قسمت ہی تھا۔ دو چار قدم چل کر میں رک جاتا ہوں اور لمبی لمبی سانسیں لے کر پھیپھڑوں میں آکسیجن بھرتا ہوں۔ وہ بھی ساتھ ہی رک جاتی ہے۔ بروکلین کی سڑک پر ڈوبتی رات کے اجڑے لمحات میں ہم خود کو گمشدہ بچوں کی مانند بے بس محسوس کر رہے ہیں، وہ مجھے دیکھتی ہے۔

Where is your Pad?

ہسکی آواز میں اب سیکس کی بجائے خوف کی لرزش شامل ہے۔ وہ میرے اور قریب ہو جاتی ہے۔ چیپ پر فیوم سے نتھنوں میں کھجلی سی ہوتی ہے، میں چھینک مارتا ہوں۔

God bless you.

وہ سڑک پر گرا پرس اٹھا کر مجھے دیتی ہے۔ اب تک میں بھی اپنے حواس میں آچکا ہوں یعنی ملنگ کے بعد جتنا کہ حواس میں آیا جا

سکتا ہے۔ اب میں پہلی مرتبہ اسے غور سے دیکھتا ہوں تو اس کی سرخ ٹی شرٹ پھٹی پاتا ہوں۔ پرس بھی غائب ہے۔ مجھے متوجہ پا کر وہ رو دینے والے لہجہ میں کہتی ہے۔

what the bastards have done to me! Look!

”مجھے افسوس ہے“

You don't have to be sorry, it is none of your fault.

”تاہم مجھے احساس ہے کہ.....“

If it's anybody's fault..... It's mine.!No

اس دوران میں جو کاریں گزریں انہوں نے رکنا ضروری نہ سمجھا۔

ہم سکول میں پٹے بچوں کی مانند گھر کا سفر شروع کرتے ہیں۔ وہ چلتے چلتے رک جاتی ہے اور دونوں ہاتھوں کے پیالہ میں میرا چہرہ لے کر ایک مرتبہ پھر پر تشویش لہجہ میں پوچھتی ہے۔

You are all right.... A'nt you?

میں اسے اطمینان دلاتا ہوں کہ اب میں ٹھیک ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہوں کہ قریبی بلاک میں میری رہائش ہے اور ساتھ ہی دعوت دیتا ہوں۔ ”دیکھو اگر تم چاہو تو رات میرے ہاں بسر کر سکتی ہو۔“ وہ ہنستی ہے۔

That's what I wanted to, but now....

وہ پھر ہنستی ہے۔

میں جھینپ جاتا ہوں۔ ”میرا وہ مطلب نہ تھا‘ دیکھو رات کافی سے زیادہ ہو چکی ہے اور غالباً تم بھی اب.....“ میری زبان لڑکھڑا جاتی ہے اور پھر میں جلدی سے بات بناتا ہوں۔ ”میرا مطلب ہے تمہارا گھر یہاں سے نہ جانے کتنی دور ہو اور۔“

I understand if it's OK, with you, it's ok with me!

وہ قریب آ کر میرا ہاتھ تھام لیتی ہے۔ مگر اب ہاتھ پکڑنے میں جنسی ترغیب نہیں بلکہ تحفظ کا احساس حاصل کرنا ہے۔ ہم دونوں ہی خوفزدہ ہیں۔ گویا یوں ہم ایک دوسرے سے توانائی حاصل کر رہے ہیں اور اپنا اعتماد بحال کر رہے ہیں۔ اسے شب ب سری کی دعوت دینا

بھی اپنی تنہائی اور خوف کو ختم کرنے کو تھا۔ مگنگ کے تجربہ کے بعد جنس کے قابل کہاں رہ جاتا ہے مرد۔

ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اپنی باتوں سے خوف زائل کرنے کی کوشش میں تھے ہم ایک دوسرے کا ڈر ختم کرنے کی کوشش میں تھے۔ اپنے قدموں کے ساتھ کسی اور کے قدموں کی چاپ کی گونج سے ایک ساتھی کی رفاقت کا احساس باعث تقویت تھا۔ شاید وہ بھی خوف کے بوجھ تلے دبی ایک اجنبی کے ساتھ چل دی تھی۔ غیر پیشہ ورانہ حیثیت میں رات گزارنے کو۔

What tought Luck! وہ بڑبڑائی۔ میں جواباً کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر سمجھ نہیں پاتا کہ کیا کہوں۔ سو خاموش رہتا ہوں تاہم اس کا ہاتھ دبا کر اسے یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ مجھے اس کی پریشانی کا احساس ہے۔

جنگل میں گرم خوفزدہ بچوں کی مانند ہم ہر نامانوس آواز پر چونک اٹھتے اور قدم خود بخود تیز ہو جاتے۔ کبھی کبھی گزرنے والی کار کی ہیڈ لائٹس میں سڑک غیر فطری انداز میں چمک کر جسم میں لرزش سی پیدا کر دیتی ہے۔ عام حالات میں روشنی سہارا بنتی ہے مگر اب عالم خوف میں وہ ہراساں کر رہی تھی۔ بند دوکانوں کی نیون سائنز منظر پر رنگ برنگ نظریں ڈال رہی تھیں۔ ٹریفک کین گھات میں بیٹھے دشمن نظر آ رہے تھے۔

بالمقابل فٹ پاتھ پر ایک پب میں سے حبشیوں کی ٹولی بے ہنگم آوازوں میں قہقہے لگاتی نکلتی ہے۔ وہ ہم پر بھی بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ اپنی ہم رنگ پر فقرے چست کرتے ہیں۔ ایک کرخت آواز میں سیٹی بجاتا ہے۔ وہ بدک کر میرے ساتھ چپک جاتی ہے۔ میرا پرتناؤ جسم ٹھنڈے پسینہ میں بھیگ جاتا ہے اور خوف کے سرد ہاتھ کو میں ریڑھ کی ہڈی سے دل کی جانب ریگلتا محسوس کرتا ہوں۔ سانس جیسے پھیپھڑوں میں اٹک جاتی ہے۔ شرابی حبشیوں کی ٹولی تنہا رات میں اتنی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ جتنا جنگل میں بھیڑیوں کا غول۔ ہم دونوں چلنا بھول کر خوفزدہ ایک دوسرے کے ساتھ لگے کھڑے رہ جاتے ہیں مگر وہ اپنے آپ میں مست ہیں خطرہ ٹل جانے کے احساس سے ہم قدرے پرسکون ہوتے ہیں۔ وہ پھنکارتی ہے۔

Dirty shits, the black shits

”شش!“ میں اسے چپ کراتا ہوں۔ میں اسے سمجھاتا ہوں۔ ”شکر کرو انہوں نے ادھر تو جہ نہیں دی سوچو اگر ہم ان کے ہتھے چڑھ جاتے تو کیا گت بنتی۔“ وہ تلخی سے بولتی ہے۔

You would be dead and I would have been.

وہ کانپ کر فقرہ نامکمل چھوڑ دیتی ہے مگر تھوڑی دیر بعد گویا ہوتی ہے۔

Still I hate the black bastards, I can't help being black,
but still I hate myself for being black, for being black trash.

میں خاموش رہتا ہوں، جانتا ہوں کہ وہ اپنے خوف کے پیدا کردہ اعصابی تناؤ میں کمی کے لئے بول رہی ہے۔ دوفرلانگ کا راستہ جو آج میلوں میں پھیل گیا تھا بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔ میں طویل سانس خارج کر کے اسے خوشخبری سناتا ہوں۔

Thank God!

شاید کسی نن نے بھی اتنے خلوص سے خدا کا شکر نہ ادا کیا ہوگا۔

میں تالہ کھولنے لگا مگر خوف اور تناؤ کے باعث ہاتھ جیسے اکڑ گیا، چابی تالہ کے سوراخ میں نہ پڑ رہی تھی۔ مزید کوشش کی تو ہاتھ سے پھسل کر گر گئی۔ وہ جھک کر چابی اٹھا لیتی ہے۔

Let Me

مجھے آج سے زیادہ یہ بیس منٹ کبھی بھی اتنی پیاری نہ لگی تھی۔

وہ روشن کمرہ کے بیچ میں کھڑی تھی، سیاہ اور سرخ رنگ کی پینٹنگ۔ میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوں وہ جیسے صوفہ پر ڈھ جاتی ہے۔

What a night, What a mess!

میں کہتا ہوں۔ ”شکر کرو کہ بچ گئے ورنہ اب تک تو ہماری خبر چھپ رہی ہوتی۔“

وہ تلخی سے کہتی ہے۔

Who will print about a black hooker, I am not a rich broad.

میں کہتا ہوں۔ ”اس کے باوجود تم اچھے دل کی نیک لڑکی ہو۔“

Thanks

میں بات جاری رکھتا ہوں۔ ”تم مجھے چھوڑ کر بھاگ بھی تو سکتی تھیں، شاید تمہارے چیخنے ہی کی وجہ سے میں بچ گیا۔“

میں ہاتھ روم کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ ہاتھ منہ دھو لے۔ اب پہلی مرتبہ اپنے کپڑوں کا احساس ہوتا ہے اور وہ رو دینے والے

لہجہ میں کہتی ہے۔

Oh, my twenty Dollar T-Shirt, my...

میں اسے بتاتا ہوں کہ میرے پاس زنانہ لباس تو نہیں مگر مردانہ کپڑے ہیں اگر وہ ان سے کام چلا سکے۔ میں اسے دھاریوں والے کپڑے کا وہ مردانہ سلپنگ سوٹ الماری میں سے نکال کر دیتا ہوں جسے امریکہ جانے کی خوشی میں میں نے انارکلی سے خریدا تھا وہ اسے دیکھ کر کہتی ہے۔

It will do.

ہاتھ روم سے برآمد ہوئی تو میک اپ دھل جانے کے بعد چہرہ کا نمک بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ کالا نمک نکھر گیا تھا۔ نیلے اور سبز رنگ کی دھاریوں والے ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں وہ بچی سی لگ رہی تھی۔ مجھے گھورتے پا کر وہ پہلی مرتبہ کھل کر ہنستی ہے۔

How do I look?

”بڑی فطری سی لگ رہی ہو۔“

وہ کھلی ہش شرٹ کے لٹکے بازو بچوں کی طرح سے ہلا کے کہتی ہے۔

May be you are right. I never felt natural, perhaps you are right.

وہ کچھ اور کہنا چاہتی ہے مگر خاموش ہو جاتی ہے۔

اب میں غسل خانہ میں جاتا ہوں۔ ہاتھ منہ دھو کر اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد میں بھی خود کو پہلی مرتبہ انسان محسوس کرتا ہوں۔ میرے آنے تک وہ بالوں میں کنگھی کر کے ہش شرٹ کے بازو فولڈ کر کے صوفہ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہے۔

”کافی چلے گی؟“ میں پوچھتا ہوں۔

No Booz?

وہ ناامیدی سے پوچھتی ہے۔

At such times you need a stiff one.

میں معذرت کرتے ہوئے اسے بتاتا ہوں کہ جس مذہب سے میرا تعلق ہے اور جس ملک سے میں آیا ہوں وہاں شراب ممنوع ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

Then I will make a cofee.

میں اسے سمجھاتا ہوں۔ ”تم مہمان ہو اس لئے کافی مجھے ہی بنانی چاہیے۔“

No way

وہ میرے ساتھ کچن میں آ جاتی ہے۔ ہم دونوں کافی بننے کے دوران باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔

”کچھ کھاؤ گی؟“

مگر وہ خود ہی بے تکلفی سے فریج کا دروازہ کھول لیتی ہے مگر اندر نا مانوس چیزیں دیکھ کر میری طرف مڑتی ہے۔

”اوہ یہ...؟“

ہوا یہ تھا کہ دودن پہلے میں جیکسن ہائٹس گیا تھا وہاں سے اپنی پسندیدہ مٹھائیاں یعنی برنی، گلاب جامن اور چم چم لایا تھا۔ ساتھ ہی دی بھلے بھی تھے۔ میں یہ سب نکال کر میز پر سجاتے ہوئے اسے سمجھاتا ہوں کہ برنی، گلاب جامن، چم چم اور دی بھلے کیا ہوتے ہیں۔

ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ درمیان میں سیاہ تلخ کافی کے مگ دھرے ہیں۔ میں اسے گلابی رنگ کی چم دیتا ہوں۔

”اسے آزماؤ۔“

وہ اسے آہستہ آہستہ سفید دانتوں سے کتر رہی ہے۔ بھاری پوٹوں کے نیچے آنکھیں جھکی ہیں، بو جھل ہونٹ کافی کلر کے ہیں۔ وہ کافی کا مگ اٹھاتی ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ میں اسے ہی دیکھ رہا ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سے مسکراہٹ آ جاتی ہے جسے چھپانے کو وہ مگ منہ سے لگا لیتی ہے۔

”موسیقی سنو گی؟“

I don't know...

”یہ پاکستانی موسیقی ہے، یقیناً تم پسند کرو گی۔“

OK

کمرے میں شریف پونچھ والے کی ستار مالکونس کی نرم پھوار بکھیرنے لگتی ہے۔ ہم دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہتے ہیں مگر اس کے باوجود شاید ایک دوسرے سے محو کام بھی ہیں۔

”تم تنہا رہتے ہو؟“

”ہاں“

”گھبراتے نہیں“

”گھبراتا ہوں“

”تنہائی میں کسی عورت کی ضرورت تو محسوس ہوتی ہوگی۔“

”کبھی کبھی“

”تب کیا کرتے ہو؟“

”کچھ نہیں“

”کچھ تو کرتے ہو گے؟“

”کچھ بھی نہیں“

”جب بہت تنگ ہوتے ہو تو اس وقت کیا کرتے ہو؟“

”ٹھنڈے پانی سے غسل۔“

میں اپنے جواب پر دل ہی دل میں ہنستا ہوں۔ وہ سکون سے کافی پی رہی ہے۔ اچانک وہ نظریں اٹھا کر مجھے دیکھتی ہے۔

Tell me about yourself.

میں اسے بتاتا ہوں۔ رات کو واپسی پر تنہا بیس منٹ منہ پھاڑے جمائیاں لیتی محسوس ہوتی تھی مگر اب اس کی وجہ سے خوشگوار خوشگوار سی محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے گزشتہ چھ ماہ میں کسی سے بھی ذاتی نوعیت کی گفتگو نہ کی تھی۔ اب جو بولنا شروع کیا تو جیسے بند ٹوٹ گیا اور میں اسے سب کچھ بتاتا جاتا ہوں۔ اپنے بارے میں، گھر والوں کے بارے میں، لاہور کے بارے میں، نیویارک کے بے وجود ہونے کے بارے میں، تنہا زندگی کی اداسی کے بارے میں، اپنے خوابوں کے بارے میں۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ ہم اپنے گندے گھروندوں میں امریکہ کے خواب دیکھتے ہیں، یہاں آتے ہیں، ڈالر کمانے کو، سفید عورتیں فتح کرنے کو، مگر یہاں آ کر اس کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ گرین کارڈ کی تگ و دو ہمیں بے وزنی کے عالم میں رکھتی ہے اور تب ایک سہانی صبح یہ احساس ہوتا ہے کہ اس عمل میں ہم سب سے کٹ چکے ہیں تب محض ماضی کی یادیں سہارا دینے کو رہ جاتی ہیں مگر کب تک؟

وہ میرے چہرے پر نظریں گاڑے سنتی جا رہی ہے۔ غالباً میرے لہجہ کی شدت سے اسے یہ احساس ہو گیا ہے کہ تنہائی کے مارے اس اجنبی شخص کے لئے یوں بولنا کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ نہ سوال کرتی ہے، نہ ٹوکتی ہے، صرف خاموشی سے سنتی جاتی ہے۔ میں

بولتا جاتا ہوں اچانک میری آواز بھرا جاتی ہے۔ میں شرمندہ سا ہو کر رک جاتا ہوں اور خفت دور کرنے کو کافی کا مگ منہ سے لگا لیتا ہوں۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔

What rotten luck

میں معذرت کرتا ہوں کہ مجھے یوں نہ بولنا چاہیے تھا مگر ساتھ ہی یہ محسوس کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ مسلسل بولنے سے میں خود کو خاصہ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ مسکرا کر مجھے دیکھتی ہے۔

Its all right, some time is better to talk otherwise you could go carzy.

ہم دونوں اٹھ کر لانگ روم میں صوفہ پر آ بیٹھتے ہیں۔ میں گھڑی دیکھتا ہوں رات خاصی جا چکی ہے۔ میں بیڈ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ وہ بیڈ روم میں سو جائے۔

And you... where would you sleep?

”میں صوفہ پر سو جاؤں گا۔“

No way... you can sleep with me.

میں نفی میں سر ہلا دیتا ہوں۔

But you wanted to sleep... when we, when we...

وہ فقرہ نامکمل چھوڑ دیتی ہے۔ میں پھر بھی انکار میں سر ہلاتا ہوں۔

you are a nice guy, but you don't have! Don't you like me? look to be so... I mean... for all you have done for me, I wont charge...

وہ سنجیدگی سے کہتی ہے اور پھر ہنس کر

The treat is on the house.

میں اسے سمجھانا چاہتا ہوں۔ تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے۔ میں اسے طوائف کے طور پر نہیں بلکہ ایک دوست، مہمان کے طور پر لایا ہوں۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ ہمارے ملک میں گھر آئے مہمان کی عزت اور خاطر کی جاتی ہے اس کے ساتھ سویا نہیں جاتا، خواہ وہ طوائف ہی کیوں نہ ہو۔ اور پھر آخری بات، تم تو مجھے بچی لگتی ہو۔“

آخری فقرہ جیسے اسے چت کر دیتا ہے، چہرہ پر سے طوائف والی نقاب اتر جاتی ہے۔ اندر سے تیرہ چودہ برس کی ایسی لڑکی نکل آتی ہے جو مردوں کی بھیڑ میں اپنا بستہ گنوا بیٹھی ہے۔ اس کی ٹھوڑی لرز رہی ہے، کپکپاتے لبوں سے احساس ہوتا ہے کہ وہ آنسو روک رہی ہے مگر روک نہیں پاتی۔ وہ میرے کندھے سے لگی رو رہی ہے۔ جسم ہچکیوں میں ہل رہا ہے، میں خاموش اسے رونے دیتا ہوں، جانتا ہوں کہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب الفاظ بے کار ہو جاتے ہیں وہ جس طرح اچانک روئی تھی اسی طرح اچانک پرسکون ہو جاتی ہے۔

I am sorry, I am really sorry.

وہ گالوں سے آنسو پونچھتی ہے، پھر ہاتھ روم میں جا کر منہ دھو کر واپس آتی ہے۔

Perhaps I needed that cry, It did me lot of good.

وہ میرے ساتھ صوفہ پر بیٹھ جاتی ہے۔

Thanks

وہ نظریں اٹھا کر گویا میرا بھرپور جائزہ لیتی ہے۔

You are a sweet guy.

میں مزید کافی پینے کو پوچھتا ہوں۔

Oh, please, If its not a bother!

میں کافی کے لئے تازہ پانی کھولنے کے رکھ دیتا ہوں۔ بے آواز برتن دھوتا ہوں، میں سوچنا چاہتا ہوں مگر ذہن بالکل خالی ہے۔ میں واپس جا کر اچھے اچھے الفاظ سے اسے تسلی دینا چاہتا ہوں، شرکت غم کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہوں مگر میری تربیت، تجربات اور مشاہدات نے مجھے کسی روتی طوائف کو تسلی دینے کے لئے تیار نہ کیا تھا۔

میں کافی لے کر آیا تو وہ گھٹنے پیٹ کے ساتھ لگائے ہونٹوں میں انگوٹھا لئے، ستار کی پھوار میں بھیگی، صوفہ پر گیند بنی، نیند کے گہرے پانیوں میں غرق تھی۔



سورج کی آخری کرن نے ہفت رنگ لباس پہنا دیا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ وہ قطرہ ہے ہر چند کہ سر پر دھنک رنگ تاج نہ تھا۔

نارس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سنان ساحل پر صرف وہی تھا، کوئی اور تنفس نہ تھا۔ تیز ہوا پر شور لہروں میں تنہا۔ شام کے پھیلتے سرمئی سایوں میں اس نے اپنا سفید لبادہ اتار دیا۔ دور سے آتی لہریں عریاں جسم سے لپٹ گئیں۔ ہوا محبوبہ کی مانند تپتے جسم کو سہلا رہی تھی۔ اس نے طویل سانس لے کر پھیپھڑوں میں نمکین ہوا بھر لی اور دیر تک اسے پھیپھڑوں میں بند رکھا۔ پھر دھیرے دھیرے ہوا خارج کی۔ ارد گرد چمکدار جھاگ نرم بستر کی مانند لیٹ جانے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس نے یہ دعوت قبول کر لی۔ لہریں چادر کا کام کر رہی تھیں۔ رات بھر کے لیے سورج غائب ہو چکا تھا۔ لہروں نے سرخ، نارنجی، عنابی اور سنہری ملبوسات اتار دیئے تھے۔ تاریکی میں لہروں کا شور تھا۔ یہ اماؤں کی رات تھی۔

نارس چت لینا منتشر ستارے دیکھ رہا تھا۔ ہوا جسم میں مساموں کے ذریعہ سے خشکی کی لہریں اتار رہی تھی۔ وہ عالم وارفتگی میں لینا ستارے نکا کیا، لہروں کا شور مسلسل آہنگ میں تبدیل ہو چکا تھا ایسا آہنگ جس کا سماعت کو شعور نہ ہو مگر آہستہ آہستہ یہ آہنگ آواز بن کر ایک پکار میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ نارس نے غور سے سنا۔ واقعی یہ لہروں کی پکار تھی، سمندر کا بلاوا۔ تعجب سے سوچا، سمندر کا بلاوا؟ مگر کیوں؟ تب اس نے سمندر کی آواز سنی، گرجدار ہونے کے باوجود سرگوشی کی مانند تھی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کولہوں پر ہاتھ رکھ کر غور سے سمندر کی طرف دیکھا جو مجسم روپ میں نارس کو تک رہا تھا۔ مرد یا عورت؟ کچھ کہا نہ جاسکتا تھا۔ یہ نیچوں نہ تھا اور نہ ہی سمندر کی وہ پریاں جو مسافروں کو لبھانے کے لیے لہروں کا لباس اتار دیتی تھیں۔ یہ ایک وجود تھا، کیسا؟ کچھ نہ کہا جاسکتا تھا مگر تھا کچھ۔۔۔۔۔۔ بازو پھیلائے۔ نارس کو بلاتا، سرگوشی کے اسلوب میں ”آؤ“ اس کی آواز لہروں کے شور پر حاوی تھی مگر نرم اور ملائم ریشم جیسی، سرگوشی میں سرگوشی۔

”یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے

تم کو بلاتے بلاتے مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
کبھی ایک پل کو کبھی ایک عرصہ، صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی

ندا آ رہی ہے

بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھا کہ ہے نہ آئندہ شاید تھکے گا

”مرے پیارے بچے“۔۔۔۔۔۔ ”مجھے تم سے کتنی محبت ہے“۔۔۔۔۔۔ ”دیکھو“

اگر یوں کیا تو برا مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی بھی ہوگا۔ ”خدا یا خدا یا“

کبھی ایک سسکی، کبھی ایک تبسم، کبھی صرف تیوری

مگر یہ صدا کہیں تو آتی رہی ہیں

انہی سے حیات دور روزہ ابد سے ملی ہے

مگر یہ انوکھی صدا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے

یہ ہر اک صدا کو مٹانے کی دھمکی دیئے جا رہی ہے۔“

گہری تھکن والی سرگوشی۔ یہ انوکھی صدا کہاں سے آرہی تھی سمندر ہوا، لہریں، قطرے؟ کہاں سے؟ سامنے دیکھا وجود اب اپنی روشنی کے ہالہ میں اسے نکلے جا رہا تھا بازو پھیلائے بلارہا تھا۔ تھکی سرگوشی مستحکم لہجہ میں تبدیل ہو رہی تھی۔

”آؤ مجھ میں سما جاؤ۔“

”مجھے تیرا نہیں آتا“

”پاگل تمہیں تیرے کو کون کہہ رہا ہے۔“

”یوں تو میں ڈوب جاؤں گا۔“

”یہی زندگی ہوگی“

نارس تذبذب میں تھا

”مگر.....“

”ڈرو مت، تم ڈر رہے ہونا!“

”ہاں میں ڈر رہا ہوں۔“

”کس سے؟ مجھ سے؟“

”پتہ نہیں شاید اپنے آپ سے۔“

”خود سے کیسا ڈرنا؟“

”خود سے تو سب سے زیادہ ڈر لگتا ہے۔“

”نہیں پہچانا؟“

وہ انکار میں سر ہلا دیتا ہے۔

”میں تمہاری روح ہوں۔“

”سائیکی“ وہ دریافت کرتا ہے۔

”نہیں، میرا سائیکی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف تمہاری روح ہوں۔“

”صرف میری روح؟ وہ تو میرے جسم میں ہے۔“

”وہ روح اور ہے میں اور ہوں۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”تم بھلا کیسے سمجھ سکتے ہو، سمجھ لو تو دیوتا نہ بن جاؤ۔“

”مگر.....“

وہ اسے سمجھانے والے لہجہ میں بولی۔ ”ہر مرد میں عورت کی روح ہوتی ہے اور ہر عورت میں مردانہ روح“

”عجیب بات ہے۔“

”مگر درست“

”ایسا کیوں ہے؟“

”شخصیت میں توازن کے لیے۔“ وہ گویا معلم ہو اور شاگرد کو دقیق نکتہ سمجھا رہی ہو۔ ”دیکھو اگر تم میں صرف مردانہ روح ہی ہو تو تم

کرخت، اجڑ اور بے ڈھنگے پن سے زندگی بسر کرو گے مگر یہ دوسری یعنی زنانہ روح ہی ہے جس کی بدولت تم میں دلربائی، محبت اور تحنیل

پیدا ہوتا ہے۔“

”اور اس طرح عورت میں مردانہ روح“

”ہاں، مردانہ روح عورت میں محنت، ہمت اور جفا کشی پیدا کرتی ہے۔“ خاموش نارس سن رہا تھا، وہ بتا رہی تھی۔

”دیوتاؤں نے ایسا اہتمام کیا ہے کہ دونوں روہیں ایک تن میں ہونے کے باوجود مل نہ پائیں، انسان اسی لیے ہمیشہ عالم تضاد

میں رہتا ہے۔ کسی وجود میں اگر یہ دونوں روہیں یکا ہو جائیں تو انسان یکتا ہو جائے، دیوتا سماں، امر ہو جائے۔“

جیسے بے لباس نارس کو دیکھ کر وہ خوشی سے تالیاں بجا رہی تھی۔ نارس کسی دوشیزہ کی مانند شرما اور گھبرا رہا تھا۔ اندھیرے میں افراتفری میں کپڑوں کی تلاش شروع کی تو دور سے آتی لہراس کے جسم کے لیے لباس کا کام کر گئی۔ ایکو والہانہ پن سے لہر کے لباس سے ٹوٹے ٹانگوں کی مانند گرتے قطرے دیکھ رہی تھی۔

نارس کو کبھی بھی اس کا اندازہ نہ ہوسکا کہ ایکو اسے کس شدت سے چاہتی ہے۔ قدرے شرمیلے کم گو اور نسوانی نزاکت والے نارس میں ایکو اپنا سراپا دکھائی دیتا تھا اسی لیے وہ اس کی دیوانی تھی۔ اتنی کہ بعض اوقات اس کا جینس مار کر رونے کو جی چاہتا، اس وقت بھی وہ دیوانہ کر دینے والی خواہش سے مغلوب ہوئی جا رہی تھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ نارس پر حملہ آور ہو اسے مغلوب کر دے جھنجھوڑ ڈالے اور اس کے ساتھ وہ سب کچھ کر گزرے جو ایسے معصوم صورت مردوں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ خنک ہوا کے باوجود ایکو کے ٹھنڈے جسم پر پسینہ کے گرم قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ تنفس میں تیزی آ رہی تھی سینہ کا مدوجزر سے مقابلہ کرنے کو تھا وہ خود پر قابو پانے کی کوشش میں تھی۔ نارس ایکو سے بلکہ خود سے بھی لاتعلقی لباس پہن رہا تھا۔ مڑا تو ایکو کے پھیلے بازوؤں میں تھا۔ ایکو کی سانس نارس کے چہرہ پر گرم آبخار کی مانند تھیں۔ ایکو کے گرم ہونٹ نارس کے روشے لبوں کو منا رہے تھے۔ بدمزہ نارس نے جھٹک کر اسے خود سے الگ کیا۔ وہ بیل کی مانند اس سے لپٹی جا رہی تھی۔ ”چھوڑو بھی“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”کیا حماقت ہے؟“ سمندر کی آتی لہروں نے نارس کو پیچھے مڑ کے دیکھے بغیر جاتے دیکھا۔ ایکو کی موٹی موٹی آنکھوں سے بہتے آنسو لہروں میں گر رہے تھے۔

ہینوی چہرہ سوئی جاگی موٹی آنکھیں سیاہی میں سپنے گھولتیں باریک ترشے ہوئے لب انار کی کلی جیسی سرخی لیے سر پر بالوں کا سنہری تاج، انگ پر شہد کا رنگ، چوڑے کندھے مردانہ وجاہت لیے، پتلی کمر زنا نہ نزاکت لیے۔ نارس کسی ماہر سنگ تراش کے الوہی تحفیل کا تراشہ زندہ مجسمہ تھا۔ یونان میں نہ حسن کی کمی تھی اور نہ حسن شناس مجسمہ سازوں کی، مگر نارس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ایک مجسمہ ساز نے تو اپالو کے مجسمہ کے لیے نارس کو استعمال کرنا چاہا مگر نارس نہ مانا۔ ایکو اگر نارس پر مر مٹی تو تعجب نہ تھا۔ ایکو پر مر مٹنے والوں میں سے بعض نارس پر بھی مر مٹے تھے۔

دیوتا نارس کو حسن دیتے وقت دل حسن شناس دینا بھول گئے اسی لیے کیو پڈ کے تیر اس کے لیے کند ثابت ہوتے۔ خود مگر خود پسند خود کفیل نارس کے لیے ایکو یا اور حسیناؤں کی نہ تو کوئی اہمیت تھی اور نہ ہی ضرورت۔ خود میں مگن نارس جاگتی آنکھوں سے سپنے دیکھتا۔ کسی خاص ہستی کے نہیں۔ کسی حسینہ کے بھی نہیں۔ یہ فرار کے سپنے ہوتے، ان دیکھی زمینوں کے سپنے، نادیدہ مناظر کے سپنے

انجانے آسمانوں کے سپنے اور سب سے بڑھ کر اپنے سپنے اپنے جسم کے سپنے کم آ میز اور کم گونا رس خود کلامی میں مگن رہتا۔

ایفروڈیٹ کے مندر میں جشن تھا۔ جس سے نارس کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دوشیزاؤں کی اکثریت کی مانند ایکو ایفروڈیٹ کی پجاریں تھیں اور اسی لیے وہ نارس کو ساتھ لے جا رہی تھی۔ اس کا بازو پکڑے ہستی ہوئی باتیں کرتی جا رہی تھی۔ خود میں گم نارس کے کانوں میں ایکو کے مسلسل بولنے کی گنج سی تھی۔ مگر یہ احساس نہ تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے۔ ایفروڈیٹ کا سفید مندر چاندنی میں چمک رہا تھا، دور ہی سے مندر کے اندر کی موسیقی سنی جاسکتی تھی۔ پر جوش ایکو مندر کی سیزہیاں تیز قدموں سے چڑھ رہی تھی۔ اندر پہنچے تو اژدھام دیکھا۔ نوجوان جوڑے، تنہا لڑکے لڑکیاں، پجاریں، پردیسی مسافر..... کبھی تھے۔ مشعل کی روشنی سے مندر کی سفید دیواروں پر بڑے بڑے لرزتے سائے طرح طرح کی شکلیں بنا رہے تھے۔ مشعلوں کی زرد روشنی کے لرزاں دائرہ میں رقص کرتی داسی صرف زیتون کے تیل کی پوشاک میں تھی۔ پسینہ میں بھیگا جسم چمک رہا تھا۔ وہ والہانہ انداز سے نیم بے ہوشی کے عالم میں سازوں سے نکلتی موسیقی کے غیر مرئی دھاگوں سے بندھی کٹھ پتلی کی مانند محور رقص تھی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے زمین پر نہیں بلکہ اویس پر رقص ہو رہا ہو، یوں کے حضور میں۔ مشعلوں کی گرم روشنی میں رقص کا انگ انگ لچک رہا تھا۔ پنڈلیاں، رانیں، نیم وا آنکھیں جس سے بھی چار ہوتیں وہ لرز جاتا۔ مردوزن کیا خود ایفروڈیٹ بھی رقص دیکھنے میں محو تھی۔ نارس نے گردن اوپر اٹھائی۔ مشعلوں کی لرزتی روشنی میں دیوی کا چہرہ زندہ محسوس ہو رہا تھا۔ لرزتی روشنی سے کھلتی بند ہوتی آنکھیں رقص کے ساتھ ساتھ نارس کو بھی دیکھ رہی تھیں دیکھ نہیں، کچھ سمجھا رہی ہوں، اشارے کر رہی ہوں۔ لرزتے سایوں سے دیوی کے ہونٹ بھی کھلتے اور بند ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ گویا وہ اسے کچھ کہہ رہی ہو، ایکو کے بارے میں اس کے رویہ پر سرزنش کر رہی ہو۔ نارس لرز گیا۔ دل میں دیوی کی عظمت کی مناجات کا ورد شروع کر دیا۔ اور پھر اچانک مشعلیں بجھادی گئیں، اندھیرا، بجھی مشعلوں سے اٹھتے دھوئیں کی بو اور اس بو پر حاوی جسموں کی بو۔ سب اسی ساعت کے منتظر تھے۔ اب وہ آزاد تھے۔ سب کچھ کر گزرنے کو۔ پیشتر اس کے کہ ایکو اسے دبوچ لیتی نارس اندھیرے میں گم ہو چکا تھا۔ تاریکی کی چادر میں لپٹے جسم سے جسم ٹکرا رہے تھے۔ پسینے میں پسینے مل رہے تھے۔ نعرے، آوازیں، آہیں، سسکیاں، تاریک منظر پر پہرہ دیتی دیوی کی نگلی آنکھیں۔

مندردیوی اور ایکو سے دور نارس نے تازہ ہوا میں لمبی لمبی سانس لے کر خود کو بحال کیا۔ اس کے اعصاب کشیدہ تھے اور وہ خاصہ گھبرا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے جشنوں میں مندر میں کیا کچھ ہوا کرتا ہے۔ اسے خود پر غصہ تھا کہ کیوں ایکو کا کہا مان کر اس کے ساتھ چلا آیا۔ نارس کو زرخیزی کی جنسی رسوم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ سرے سے اسے عورت اور اس سے متعلق لذتوں ہی سے کسی

طرح دلچسپی نہ تھی۔ مگر نارس کا حسن ایسا من موہنا تھا کہ کنواریاں خود بخود اس کی طرف کھنچی چلی آتیں مگر اس کی سرد مزاجی ان کے بڑے ہاتھ جھٹک دیتی۔ دوشیزائیں جس شوق سے اس کی طرف بڑھتیں اسی شوق سے پیچھے ہٹ جاتیں۔ یہ تو نامرادا کیونہی جو اس کا سایہ بنی رہتی اور نارس کے جسم کی بازگشت میں تبدیل ہو چکی تھی۔

ایکویسی گئی گزری بھی نہ تھی، کتابی چہرہ پر بڑی بڑی روشن آنکھیں نمایاں تر تھیں۔ باتیں کرتی، ہنستی بولتی آنکھیں! سنہری بالوں کی آبخار کمر تک جاتی، سب گردن، بھرے بھرے مدور شانوں اور پتلی کمر سے بننے والی مثلث میں اس کی ابھری چھاتیاں جاذب نظر تھیں۔ کئی مجسمہ سازوں نے اس کا مجسمہ بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر اسے بے لباسی کی شرط منظور نہ تھی۔ ایکو کو بہت پہلے نارس کے کچھ عجیب سے ہونے کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس کی جھکی جھکی سی خوابیدہ آنکھیں، کم آمیزی پر مبنی کھویا کھویا انداز سب کے بارے میں لاتعلقی..... دراصل ایکو اسی پر مر مٹی تھی وہ خود کو عاشق اور نارس کو معشوقہ سمجھ کر اس کا اس طرح پیچھا کرتی جیسے عاشق، نا آموز معشوق کو رجھانے کے لیے کرتا ہے۔

نارس واقعی عجیب تھا مثلاً اسے عام یونانی نوجوانوں کی طرح جمنازیم کی ورزشوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی نہ کھیلوں کا رسیا، نہ نیزہ بازی سے شغف اور نہ ہی گھڑ سواری سے آگاہ۔ حتیٰ کہ اسے تو کسی دوڑ میں شرکت بھی گوارا نہ تھی۔ اولمپک مقابلوں میں جیتے قابل فخر لارلز اس کے لیے بے وقعت تھے۔ اگر وہ شاعر یا مغنی یا فلسفہ دان ہوتا تو ورزش اور کھیلوں سے لاتعلقی کا جواز ہو سکتا تھا۔ مگر وہ محبت بھرے غنائے لکھنے والا شاعر بھی تھا۔ شاعر نہ تھا تو تمثیل نگار ہی ہوتا، دلدوز المیے قلم بند کرتا مگر اس کے برعکس وہ تو خود سوفو کلیز کا ناتراشیدہ کردار معلوم ہوتا تھا۔ گمشدہ ایڈی پس، جو کاٹا کے کھوج میں۔

ایکو کو اس عجیب نارس سے اپنی نادان محبت اور اس سے جنم لینے والی بدبختی کا احساس تھا مگر دل سے مجبور تھی۔ نارسائی کے اندوہ کی شکار ایکو نارس کے حسن کے ہالہ میں تبدیل ہو چکی تھی۔

ایکو نارس کو اس لیے مندر میں لائی تھی کہ جنس رقص اور شہوانی فضا اس برف میں خفتہ چنگاری کو بیدار کر دے گی لیکن مشعلیں گل ہوتے ہی وہ ہاتھ چھڑا بھاگا۔ بد مزہ ایکو بھی مندر سے باہر آ گئی، تنہا دیکھ کر ایک دونو جوانوں نے اسے سنبھالنا چاہا مگر اس کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے۔ ایکو کھوجتی رہی مگر نارس کہیں نظر نہ آیا۔ کہاں جاسکتا ہے؟ ایکو نے پریشان ہو کر سوچا۔

درخت، پھل، پھول، پتے، پانی، پتھر..... چاند سب کو غسل دے رہا تھا۔ پھولوں کی خوشبو ہوا میں گھل گئی تھی۔ خوش منظر پہاڑیوں کے دامن میں بیضوی جھیل اور جھیل میں چاند آبی چادر پر ہوا کی شکنیں دائرہ در دائرہ! نارس کنارے پر خاموش سر جھکائے

بیٹھا تھا۔ وہ مندر رقصہ ایکو سب کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ سب کسی اور دیس کے لوگ تھے جن میں وہ اجنبی تھا۔ ہاں! یہ اس کی اپنی دنیا تھی۔ دوشیزاؤں سے دور پرسکون، پرسکوت! مگر خارجی منظر کی مانند وہ خود پرسکون نہ تھا۔ من میں بے چینی کا طوفان مچل رہا تھا، بے چینی کیسی؟ سمجھ نہ پا رہا تھا، دل جیسے کسی نادیدہ ہاتھ کی مٹھی میں مسلا جا رہا ہو۔ پرتناؤ اعصاب دل کی دھڑکن میں اضافہ کر رہے تھے۔ کہاں ہے عافیت کی منزل؟ وہ ماں کے بغیر خود کو گمشدہ بچہ محسوس کر رہا تھا۔ میں کون ہوں؟ کیوں دیگر نوجوانوں جیسا نہیں، میرا کیا بنے گا؟ خیالات لہر لہر اندیشے بھنور در بھنور!

پیشتر اس کے اسے احساس ہوتا وہ رو رہا تھا، اچانک یوں آنسو بہے کہ متحیر رہ گیا۔ آنسو جو بہنا شروع ہوئے تو پھر نہ تھے، اس نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہ کی، خاصی دیر بعد آنسو تھے، مگر سوکھی سسکیوں سے کبھی کبھی جسم میں لرزش کی لہر دوڑ جاتی۔ تب اس کی بھیگی آنکھوں کے سامنے وہ نمودار ہوئی۔ آبی چادر ہٹا کر وہ کس وقت لہروں پر آگئی نارس کو کچھ اندازہ نہ تھا، منور وجود جھیل پر اپنا اجالا پھیلا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکراتی ہے۔

”اداس ہو؟“

نارس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیوں؟“

”معلوم نہیں۔“

”بے سکون ہو؟“

”ہاں“

”کیوں؟“

”معلوم نہیں۔“

”کسی سے جی نہیں بہلتا؟“

”ہاں“

”کیوں“

”معلوم نہیں“

”تو ہمیں معلوم کیا ہے؟“

”میں کچھ نہیں جانتا کچھ سمجھ نہیں پاتا۔“

”عافیت چاہتے ہونا؟“

”ہاں“

”مجھے پہچانا؟“

”ہاں“

”کون ہوں“

”میری زنا نہ روح“

”ہاں!“ وہ اسے دیکھ رہی ہے فاصلہ کے باوجود نارس خود کو اس کی آنکھوں میں ڈوبتا محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر پوچھتی

ہے۔

”قرار چاہیے؟“

”ہاں“

”تو آؤ“ بازو پھیلا کر بولی۔ ”تم مجھ میں سے ہو اور میں تم میں سے.....“

آؤ مجھ میں سما جاؤ یہ خود میں سمانا ہوگا۔“ نارس خاموشی سے اسے ٹکا کیا گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”ہم ایک ہو جائیں گے نہ تم تم رہو گے نہ میں میں..... ایک جان ہو جائیں گے۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھی۔ ”وحدت ہی تکمیل

ہے۔“ اس نے پھر بازو پھیلا دیئے۔ ”آؤ گے؟“

”ہاں ہاں!“ نارس نے عالم دار فستکی میں جواب دیا۔

”تواٹھو“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”قدم بڑھاؤ۔“

نارس نے پاؤں بڑھایا۔

”اور.....“

وہ اور آگے بڑھا۔

”اور.....“

وہ اور آگے بڑھا۔

”اور.....“

نارس بڑھتا گیا، اپنے وجود کی دھن پر۔ اس کی آنکھیں نارس کو کھینچ رہی تھیں، ان آنکھوں میں ڈوبا نارس گہرے پانیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ کنارے پر کھڑی اکیو سسکیوں میں اسے آوازیں دیتی رہ گئی، نارس جھیل میں غائب ہو چکا تھا، صرف لہروں پر چاندنی کی جھلک تھی۔ کنارے پر جھکی اکیو نارس کو پکار رہی تھی۔ جواب میں جھیل کا پانی خاموش، ہوا خاموش، درخت خاموش، پھول خاموش..... واقعہ کے تمام چشم دید گواہوں نے خاموشی کی قسم کھا رکھی تھی۔

اکیو ہر روز جھیل کنارے بیٹھی نارس کا انتظار کرتی ہے۔ کبھی کبھی عالم بے تابی میں اسے پکارتی ہے مگر جواب نہیں آتا۔ ایک دن اکیو نے پانی کی لہروں پر ایک خوبصورت، انوکھا، انجانا، محبوب اور محبوب پھول ابھرتا دیکھا۔ پھول سوگھتی ہے تو پھول کے بدن سے نارس کے بدن کی مہک آ رہی ہے۔ وہ والہانہ پن سے پھول کو گالوں سے لگاتی ہے، آنکھوں سے لگاتی ہے، چومتی ہے مگر پھول سرد ہے، لائق ہے، نارس کی مانند!

اکیو پھول سے باتیں کرتی ہے، گلے شکوے، شکایات، ہجر کی کلفت، جدائی کا احوال سناتی ہے، مگر پھول خاموش ہے۔ بھلا پھول نے بھی کبھی باتیں کی ہیں؟



گرودکشنا

آ نکھ کھلی تھی مگر پھر بھی بند محسوس ہو رہی تھی۔ گویا ایک سپنے کی سیما سے نکل کر دوسرے کی سیما میں داخل ہو گیا ہو اس نے دبدھے سے ارد گرد دیکھا۔ یہ سپن سیما نہ تھی اپنا ہی استھان تھا۔ کئی کی دیواروں پر اندھیا رے کا لپ ہور ہا تھا۔ فرش کی ٹھنڈک ہڈیاں کڑکڑا رہی تھی۔ سریر پر بے اعتباری سے ہاتھ پھیرا تو اچرنج کا جھٹکا لگا۔ یا ہاتھ غیر کا ہے یا پھر سریر اپنا نہیں۔

زور سے آنکھیں میچ کر دھیرے دھیرے کھولیں مگر نہیں وہ سپنے میں نہیں بلکہ اپنی ہی کٹی میں تھا۔ سریر پر ایک بار پھر ہاتھ پھیرا۔ اب کے ہاتھ سے جینو چھوا۔ اس نے سختی سے جینو کو یوں پکڑ لیا گویا اس سے شکتی حاصل کر رہا ہو۔ جینو اس کی پوروں میں شکتی کی لہریں اور ان میں جوار بھانا پیدا کر رہا تھا۔

”ہے پر بھو!“ اس نے گویا فریادی۔ ”یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔“

اب تک اسے اٹھ جانا چاہیے تھا مگر کئی دنوں کی مانند آج بھی اٹھنا دو بھر تھا۔ من چاہتا مٹی کا یہ بستر اور بھی سخت ہو جائے۔ کھر درا بن جائے۔ نو کیلے پتھروں کا، کانٹوں کا، کیلوں کا بن جائے۔ روم روم میں پیڑا سما جائے ایسی پیڑا جو سریر کی گانٹھیں کھول دے، یوں کہ تن پھل ہو جائے اور من شانت!

”پر بھو شانتی!“

کئی سے باہر آیا۔ ابھی اندھیرا تھا۔ چاند پیڑ کی شاخیں پکڑے نیچے وادی میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ تارے کالج کی بے جان کرچیوں جیسے تھے۔ ہوا میں بسی ٹھنڈی تن پھول پر ٹھنڈی اوس اتار رہی تھی۔ کئی کے ارد گرد پھول جیسے نیند میں تھے مگر اپنی باس کو من میں نہ سمیٹ پائے تھے۔ وادی میں اترتی پگڈنڈی کوڑیا لے کی مانند لہریا لے رہی تھی۔ لمبی لمبی سانس لے کر گندھ من میں بھر لی۔ جی چاہا، بازو پھیلا کر وادی کو بازوؤں میں لے کر مسل ڈالے، مگر نہیں اسے خوشی میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ خاموشی سے ننگے پاؤں آ بشار کی اور چل دیا، تلوں تلے کنکروں کی نوکیں جن کا اسے احساس نہ تھا۔ زبان جاپ کر رہی تھی۔ پر بھو! پر بھو! زبان کیا سارا انگ ہی جاپ کر رہا تھا ہر دے کی کلپنا، منو کا منا۔ ”اوم! اوم!“

نہی آ بشار کی ٹھنڈی دھار میں بیٹھا تو ٹھنڈ نے گھات میں چھپے روو دھگی کی مانند اچانک سریر پر ہلہ بول دیا اور سریر جیسے مارے

ڈر کے سن ہو گیا اور پھر انگ انگ باغی ہو گیا مگر دانت بھیج کر ہلٹے اور کپکپاتے پٹھے قابو میں کئے۔ ”اوم اوم“ جاپ تیز ہو گیا۔

تب اچانک سریر جیسے سور یہ استھان میں تبدیل ہو گیا۔ جس طرح وادی پر آہستہ آہستہ سور یہ کی گرم نگاہ پھرتی ہے اسی طرح انگ انگ پر گرم گرم ہاتھ پھرنے لگے۔ روم روم بلبلا نے لگا، جل جوالا میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ ”ہے پر بھو، ہے پر بھو“ لہراتی پگڈنڈی اوپر لے جا رہی تھی، اگرچہ اوگٹ تھی مگر اس کی پہچانی تھی۔ اس لیے وہ آنکھیں موند کر کے بھی چل سکتا تھا۔ ننگے ٹھنڈے دھلے پیر تیزی سے اوپر لے جا رہے تھے۔ سانس پھولنے کو تھی مگر پیر تیز ایک کے بعد ایک۔ سامنے کی ہوا باٹ روکنے کو بازو پھیلائے، مگر وہ تیز ہی رہا۔ ”اوم اوم!“ وہ اب چوٹی پر تھا۔

دل دھک سے رہ گیا۔ گردو یو اس سے پہلے ہی اونچی چٹان کی مگر پر پورب اور منہ کئے گویا بھور چتر بنے بیٹھے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گردو یو کے بعد پہنچا تھا اور نہ وہ تو ہمیشہ ان سے پہلے چوٹی پر پہنچ کر استھان صاف کر کے ان کی باٹ تکتا تھا۔ گردو یو آنکھیں بند کئے ہلکورے لیتے انگ کے ساتھ ہولے ہولے جاپ کر رہے تھے۔ اس نے آج تک گردو یو کو آنکھ بھر کر نہ دیکھا تھا سوا ب بھی ان کی اور نہ دیکھ پایا۔ اسے معلوم تھا کہ مندی آنکھوں کے باوجود بھی گردو یو اس کے آ پار دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے خاموشی سے ان کے چرن چھوئے اور ان کے پیچھے بیٹھ گیا، آنکھیں موند لیں، ہاتھ جوڑ لیے اور تن من دونوں کو اوم جاپ کی جوالا میں ڈال دیا۔ بکھری سانسیں آہستہ آہستہ ایک ڈور میں بندھتی جا رہی تھیں۔ ایک سانس دائیں نتھنے سے اس نے آہستہ آہستہ نکالی، دوسری سانس بائیں نتھنے سے لی اور جتنی دیر تک پھیپھڑے میں روک سکا روکے رکھی، پھر دائیں نتھنے سے آہستہ آہستہ نکالی۔ تھوڑی ہی دیر میں سانسوں کی سمرن قابو میں آگئی اور پھر شانتی کے ساگر نے اسے اپنے بازوؤں میں چھپالیا۔

رات کے گھور اندھیارے میں سور یہ نے پاتال کا سفر ختم کر لیا تھا اور اب اپنی جانی پہچانی دھرتی پر واپسی سے وہ نہال تھا۔ پر بت، وادی، درخت، جھاڑیوں، پکھیر و سب کو دھوپ کا اشان کر دیا۔ تب گنگن سا گر کی نیلا ہٹ چمکیلی ہو کر اور سندر ہو گئی، پھول بن مہکا اور مور نے مست ہو کر چتر کاری شروع کر دی۔

گردو اور چیلہ پر بت سے ابھرتے سور یہ کی سیندوری نکلیے گویا آنکھوں دوارے من میں اتار رہے تھے، جاپ جاری تھا۔ ”اوم“

تب اسے یاد آ گیا کہ وہ کیوں اشانت ہے۔ سنے میں اس نے درگاہ دیکھی تھی۔ شیر پر سوار بھی وہ قد آور محسوس ہو رہی تھی اگرچہ وہ

اسے پاس دیکھ رہا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ وہ خاصی دور بلکہ بہت ہی دور ہے۔ اس نے جھک کر سیس نوانی چاہی مگر جیسے کوئی انجانے ہاتھ روک رہے ہوں۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا، بھگت بن کر نہیں بلکہ مرد بن کر جیسے پرش اپنی استری کو دیکھے پوتر دیوی کو سندر نار کے روپ میں دیکھ رہا تھا لو بھی بن کر۔ لکشمی ہوتی، سرسوتی ہوتی تو خیر۔ مگر درگاہ میا؟

مہا پاپ! اور اسی روپ میں اب وہ اسے پھر دیکھ رہا تھا۔ سامنے گنگن کی افشاں کے درمیان، سور یہ کی سیندوری مکئی میں دیوی میا کو دیکھ رہا تھا بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے درگاہ اسی کو تک رہی تھی اور پھر وہ مسکاتی ہے۔ سندر نار کی مدھر مسکان۔ اس مسکان میں کیا تھا؟ پیار تھا کہ دل اسے طنز تھی کہ تمسخر یا پھر وچن، گھمبیر وچن، پھیلے گنگن سا اور اونچے پر بت سا مگر سریر کیوں سوکھا پتا بنانے چاہئے ہے اور پسینہ کیسا؟

”ہے پر بھوشانتی! ہے پر بھوشانتی!“

”اوم اوم“

گرو اور چیلہ خاموش آگے پیچھے چل رہے تھے، پر بت وادی اور پرے بن، پکھیلوں کی آوازوں سے گونج رہے تھے۔ گرو آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ گرو دیو بے حد کمزور ہو چکے تھے، کتنی عمر ہوگی گرو دیو کی؟ مگر گرو دیو تو بڑی مانند عمر چھپائے تھے ان کی چھاؤں میں بیٹھا جاسکتا تھا مگر چھاؤں سے کچھ پوچھا تو نہیں جاتا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ گھنا بڑا آب سوکھی ڈالی کا پیلا پات ہو رہا تھا۔ لے گئی پون اڑا۔

اپنی تپسیا سے گرو وشوامتری مانند دیوتاؤں کا سنگھاسن ہلا سکتا تھا۔ چیلے کو اس کا وشواس تھا مگر نہیں وہ کبھی بھی ایسا نہ کرے گا، وشوامتر تمام تپسیا اور بدھی کے باوجود بھی مینکھا کے چھل کا شکار ہو گیا تھا مگر گرو دیو کچا رنگ نہ تھے جو ہر جل میں گھل جائے۔ چیلے کو اس کا بھی وشواس تھا اور اس وچار سے چیلے کا سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ وہ اس مہا گرو کا داس ہے جس کے ایک بول پر جیون کا بلیدان دیا جاسکتا ہے، مگر پھر بدھا کے ناگ نے چھن اٹھایا، کہیں ایسا تو نہیں کہ گرو دیو بھی کسی مینکھا کے ڈسے ہوئے ہوں اور اندر کے وشوامتر سے بھاگ کر یہاں آچھے بیٹھے ہوں۔ ”ہے پر بھوشانتی“

جی! یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے، میرے وچار اتنے بچ کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ دیوتا سمان گرو کے لیے ایسا وچار بھی مہا پاپ ہے۔ اس نے شکتی کے لیے جینو چھو اتو خود کو بہتر پایا۔ گرو چپ کی چادر اوڑھے آگے پیچھے چلتے گئے۔

کئی کے قریب پہنچ کر گرو خاموشی سے پیڑ کے سائے تلے چوڑے پتھر پر بیٹھ گئے۔ وہ ان کے سامنے کھڑا رہا۔ انہوں نے اسے

پیار بھری نظروں سے دیکھا ایسی نظر جو خود سے بھی چھپائی جاتی ہے۔ مدت ہوئی انہوں نے من پھلواری سے ایک ایک کر کے خوش رنگ پھول نوچ پھینکے تھے یہ ضروری تھا۔ ودیا کی جس باٹ پر وہ چلے تھے اس میں کھل رہنے کے لیے مایا موہ سے چھٹکارا ضروری تھا مگر کیا میں کھل رہا؟

یہ سوال کئی مرتبہ خود سے کیا تھا مگر جواب نہ ملا نہ باہر سے نہ اندر سے۔ ویسے تو سوال کرنا ہی پاپ تھا۔ سوال کو شک جنم دیتا ہے اور سوال کا جواب اور بہت سے شک پیدا کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ شک اس خود سپردگی میں بھی بہت بڑی رکاوٹ ہے جس کے بغیر نہ سریر کی بھانڈوں سے کتنی مل سکتی ہے نہ ساقی اور نہ ہی بھگوان۔ یہ تھا گردیو کے تمام گیان کا نچوڑ اور ادھ کھلی آنکھوں کا دھارا!

چیلے نے ٹھلیا میں سے دودھ نکالا اور بدھنا بھر کر رکھ دیا جسے انہوں نے آہستہ آہستہ گھونٹ گھونٹ اندر اتارا۔ اس نے کچھ پھل بھی سامنے رکھے مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر انکار کا اشارہ کیا۔ بھور سے سندھیا تک بس یہی دودھ کافی تھا وہ تو یہ بھی چھوڑ چکے ہوتے مگر بالک کی مانند سریر کو بہلانا بھی تو ضروری تھا پر نتو کم سے کم کھلونوں سے۔ اگر کھانا پینا ہی تھا تو بستی تیا گنے کی کیا ضرورت تھی۔

اٹھنے لگے تو جیسے دھرتی نے چرن تھام لیے۔ سہارے کے لیے چیلے کی اور ہاتھ بڑھایا۔ اس کا سہارا لے کر اپنی کئی کی طرف چلتے ہوئے گردیو نے چیلے کے بارے میں وچار کیا۔ اس کے کاٹھ کڑے سریر کو بھی میری مانند ایک دن گھن لگ جائے گی۔ گردیو اپنے گردیو یاد آگئے جو بعد میں اسی کی طرح نرمل ہو کر رہ گئے تھے۔ جن کا اتم سمسکار اس نے کیا تھا اور اب میرا یہ کرے گا۔ انہوں نے لمبی سانس لے کر سوچا یہی بھگوان کی اچھا ہے۔ کئی کا دروازہ بند ہو گیا اگلے دن تک کے لیے۔

بدھنے میں گردیو نے تھوڑا دودھ چھوڑا تھا چیلے نے اسی کا گھونٹ بھر لیا۔ من بالک پھلوں کے لیے مچا مگر اس نے جھڑک دیا۔ میں دن بدن پیٹو ہوتا جا رہا ہوں۔ گردیو دو گھونٹ دودھ پر جی سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں؟ اپنی کئی میں گیا وہاں سے سوکھی روٹیاں اٹھائیں دودھ کی ٹھلیا لی اور پھولوں کے جھاڑ اور جھاڑیوں کے درمیان ابھری چٹان پر بیٹھ گیا۔ پرندے اور جانور جیسے اسی کے منتظر تھے اس کی اور لپکے چلے آ رہے تھے۔ وہ سوکھی روٹی کے ٹکڑے مروڑ مروڑ کر پھینکتا رہا۔ وہ اس کے گرد منڈلاتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ طوطا، مینا، کوا، چڑیا بھی تھیں اور خرگوش اور گلہری بھی۔ مگر اس کی متلاشی آنکھیں ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں اور پھر وہ اسے جھاڑیوں میں گویا شرم سے منہ چھپائے نظر آ گیا۔ اس نے پیار سے چکار کر بلایا تو آہستہ آہستہ وہ اس کے قریب سرکنے لگا۔ یہ ہرنی کا بچہ تھا نہ جانے ہرنی کہاں تھی۔ چند دن سے اس نے صبح صبح آنا شروع کر رکھا تھا مگر ابھی رام نہ ہوا تھا اور فوراً بک کر قلاچ بھر جاتا۔ چند قدم اس کے قریب آ کر اس نے گردن اٹھا کر بڑی بڑی بادامی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر اسے غور سے دیکھا غیر متوقع آہٹ

لینے کو کان بل رہے تھے اور سن گن لینے کو نتھنے پھڑک رہے تھے مگر جب روٹی والا ہاتھ بڑھا کر چکارا تو آہستہ آہستہ محتاط قدموں سے اس کی جانب بڑھا۔ پھر رک کر اسے دیکھا، خرگوش اور گلہری اس نامانوس وجود کو تنگ رہے تھے۔ جب مینا اس کی پیٹھ پر بیٹھ گئی تب اس کا ڈر ختم ہو گیا اور وہ بے کھٹکے اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے روٹی کھلاتے ہوئے اس کی پیٹھ سہلانی شروع کر دی۔ کئی دن بعد وحشی رام ہوا تھا۔ اس نے اسے گود میں بٹھالیا تھا۔ ہرنی کا بچہ پر سکون نظروں سے ارد گرد کے پرندوں اور جانوروں کو دیکھ رہا تھا۔ جب گود سے اتارا تو اس نے قلاچ بھری پھر رکا اور گردن میڑھی کر کے اسے دیکھا۔ اس کی پور پور سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ پرندوں اور جانوروں کے ساتھ گزارے ان لمحات میں عجب آنند تھا۔

اور پھر اس نے شوک سنی!

رات کی رانی کے جھاڑ کے پاس کنڈلی مارے ناگ مہاراج راج رہے تھے، سیاہ چمکیلی جلد لاش کر رہی تھی۔ گول گول سرخ آنکھیں اسی کو تنگ رہی تھیں۔ دو شاخہ زبان لہرائی۔ اس نے مٹی کے پیالے میں دودھ ڈال کر اس کے آگے دھر دیا۔ ناگ مہاراج کی سرخ آنکھیں دودھ کی سفیدی میں گویا اترتی جا رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ دودھ پی رہا تھا اور پھر دودھ ختم کر کے وہ گویا سامنے سینہ تان کر بیٹھ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے تھے۔ وہ آنکھوں کے سرخ بھنور میں خود کو ڈوبتا ابھرتا محسوس کر رہا تھا۔ ناگ مہاراج کی آنکھیں جیسے اسے کچھ سمجھا رہی تھیں مگر وہ یہ بدیسی بولی سمجھ نہ پا رہا تھا۔ ناگ اس کی اور کھسک رہا تھا، وہ خوفزدہ نہ تھا مگر یہ سوچے بغیر رہ بھی نہ سکا۔ ”کیا مجھے ڈسنا چاہتا ہے؟ اگر بھگوان کی یہی اچھا ہے تو زہر کی یہ کٹوری قبول“

ہر چند کہ اس کی جٹاؤں سے لگانہ پھوٹی تھی مگر پھر بھی شکر دیوتا کی مانند ناگ اس کی گردن کا ہار بنا جھولے لے رہا تھا۔ ناگ اب نیچے اتر رہا تھا۔ وہ ناف کے قریب پہنچ کر ختم گیا، دو شاخہ زبان ناف میں گدگدی کر رہی تھی۔ جسم میں سنسناہٹ کی گرم ندیاں اچھل رہی تھیں۔ ناگ نے نشیبی سفر جاری رکھا اور پھر وہ جیسے ٹھٹھک کر رک گیا۔ ہم جنس کے وجود سے گھبرا گیا۔

وہ گلے میں جھولی ڈالے بستی کو رواں تھا!

روٹیاں، پھل اور دودھ ختم ہو چکا تھا۔ اسے گرو دیو کی یا اپنی چٹانہ تھی کہ کھائے پیے بغیر کئی دن گزر سکتے تھے مگر پرندوں اور جانوروں کا کیا بنے گا۔ وہ بھوکے نہ رہیں یہ اب اس کی ذمہ داری تھی۔

صبح کے چلے کو دو پہر آگئی مگر پسینہ میں شرابور ننگے سر، ننگی کمر، ننگے پاؤں چلا جا رہا تھا۔

وہ اچھوتوں کی بستی سے گزر رہا تھا۔ باٹ پڑنے والے اسے پر نام کر کے ہٹ جاتے۔ بعض مہلاؤں نے چرن چھونے کی کوشش

کی گمراس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ایک نے مریل ساسیاء بچہ پیروں پر رکھ دیا اور بنتی کرتے ہوئے روندھی آواز میں بولی۔
 ”گو سائیں! یہ مر رہا ہے اسے بچالو۔“

بچہ گود میں لے کر اس کے سر اور جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے لیے پرارتھنا کی۔ بچہ ہڈیوں کی مالا بنا تھا۔ بچہ نے ایک مرتبہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، مسکرانے کی کوشش کی اور پھر اس کی گردن ڈھلک گئی۔ بچہ کی ماں اس کے پیر آنسوؤں سے دھور رہی تھی۔

”اٹھو ماتا“ اس نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور بچہ اس کی گود میں دے دیا۔ وہ کبھی بچہ کو اور کبھی اسے تک رہی تھی۔
 ”تم..... تم..... برہمن ہو کر بھی؟“

”ماتا! بھگوان کی نظر میں سب ایک ہیں میں تم اور وہ بیل!“
 ”پھر بھی..... پھر بھی؟“ اس سے بولا نہ جا رہا تھا۔

اس نے اچھوت اہلا اور اس کی گود کے مردہ بچہ کو ڈنڈوت کی اور چل پڑا۔

اچھوتوں کی بستی کے بعد دور رہا آ گیا۔ ادھر دواؤں کا باڑا اور ادھر ویشیا نگر۔ دونوں راہیں کھوٹی تھیں۔ ودوا شراب ناری تھی کہ پتی دیو کو کھا گئی لہذا بیاہتا اور گھر سنسار کا سکھ پانے والی استریوں کو اس کے در بھاگے اور منحوس سایہ سے بچانے کے لیے بستی باہر رکھا گیا تھا۔ رہی ویشیا تو وہ تو ہے ہی آگ۔ پرش کا سکھ جی بدھی دھن اور سب سے بڑھ کر اس کی شکتی چھین لینے والی کل جگ کی کل ناری! ہر مرتبہ کی مانند وہ اس مرتبہ بھی دور رہا پر آ کر ٹھٹھک سا گیا۔ گردیوں نے کہا تھا۔ ”سنسار ایک ہے سب ایک ہیں“ میں تم درخت جانور۔ ایک میں انیک چھوت چھات کے مایا کے لوبھیوں کے لیے ہے یہ پاپ ہے۔ ہم تپسیا سے بچ کی کھوج میں ہیں ہم چھوت چھات پر دشاوش نہیں کر سکتے اس لیے کہ میرے وجود سے الگ کچھ نہیں اگر چہ الگ دکھتا ہے۔ تم اچھوتوں کی بستی میں بھی جاسکتے ہیں اور ودوا باڑہ میں بھی اور ویشیا نگر میں بھی۔ میں پاپ اور پن سے بہت آگے نکل چکا ہوں اور.....“
 ”میں؟“

”تم بھی ایک دن پاپ اور پن کے چکر سے نکل جاؤ گے مگر ابھی نہیں ابھی بہت اوکھت گھاٹیاں ہیں۔ تپسیا اور سے چاہیے۔“
 سندھیا کی بیلا تھی وہ گردیوں کے چرنوں میں بیٹھا تھا۔ گنگن سرسئی ہو رہا تھا اور ہوا پکھیر و گیت کے ہار لا رہی تھی۔ تب اس نے پوچھا۔

”پاپ کیا ہے گرودیو؟“

”کچھ نہیں سوائے اس کے تم اپنا پن خود نہیں اٹھاتے۔“

”اور پن؟“

”کچھ نہیں سوائے اس کے تم اپنا پاپ خود اٹھا لو۔“

”اور باقی؟“

”کچھ نہیں سوائے اس کے تم جسے چاہو جو سمجھ لو۔“

”اور بھوک بلاس؟“

”کچھ نہیں سوائے اس کے کہ رنگ رس کی مایا کو شکستی مان لو۔“

”اور مایا؟“

”کچھ نہیں سوائے اس کے تم اگن کو جل جان کر اس سے اشنان کر لو۔“

”اور اگن؟“

”کچھ نہیں سوائے اس کے تم جل کو جل نہ جانو۔“

”اور جل؟“

”کچھ نہیں سوائے اس کے تم اگن کو اگن نہ جانو اور اسی سے اشنان کر لو۔“

اور اب وہ دورا ہے پردہ ہا میں کھڑا اس و چار میں تھا کہ دودا اور ویشیا میں سے کون اگنی ہے اور کون جل؟

سر جھٹک کر گویا و چار جھٹکنے چاہے۔

”ہے پر بھو! ہے پر بھو!“

یہ چنتا میری تو نہیں نہ میرا دودا سے سمبند نہ ویشیا سے۔ میرا تو سرے سے ناری سے ہی کسی طرح کا سمبندھ نہیں، تو مجھے اس

سے کیا دودا یا ویشیا میں سے کون اگن ہے اور کون جل؟ میرے لیے تو دونوں ہی بیکار ہیں خواہ اگنی ہوں یا جل؟

وہ نر اشا کا مارا گرد دیو کے پاس مکتی کے لیے آیا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ کھونج کی کالی ڈگر کشن بھی ہے اور دور بھی اتنی دور کہ جیون

ڈور کی گانٹھیں کھولتے جاؤ، کھولتے جاؤ تب کہیں آخری گانٹھ پر مکتی مل جائے تو مل جائے ورنہ آخری گانٹھ کھولتے کھولتے ہی منش کا

دیہانت ہو جاتا ہے۔ پرنتو گرود یو تو مکت ہو چکے تھے۔ گرودیو نے تو اپنی زبان سے اتنا بڑا دعویٰ نہیں کرنا تھا لیکن وہ جانتا تھا ان کا انگ انگ پور پور روم روم کھوج کی کٹھنایوں کی کٹھنا سنا محسوس ہوتا۔ شانت مکھتی کا چتر تھا۔ وہ منش ہوتے ہوئے بھی منش سے بڑھ کر پراکرتی کا حصہ بن گئے تھے پر تھوی سامان ہو گئے تھے۔

اور مکتی کی اس اوگھٹ ڈگر پر گرودیو کی سہائتا سے وہ بھی پگ پگ چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ ابھی تک وہ آشا اور زراشا کے دبدھے میں تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ ایک دن اشانتی کا انت ہوگا اور وہ شانت ساگر ہو جائے گا، سریر کے جوار بھانا سے آزاد اشانتی کے کواڑ کھلنے سے ہی مکتی بھون میں پراپت ہو سکتے ہیں۔

وہ دودوا باڑہ کے سامنے تھا۔

وہ آ کر ہمیشہ خاموش کھڑا ہو جاتا تھا لیکن خود بخود اس کے آنے کی جیسے اطلاع ہو جاتی اور کوئی نہ کوئی مہلا سفید مگر گندی ساڑھی میں لپٹی اسے کچھ نہ کچھ دے جاتی۔

گرودیو کا یہ حکم تھا کہ من کی بھاؤ نا ختم کرنے کے لیے نیچی جاتی، اچھوتوں اور ان دودواؤں سے مانگا کرو جن سے سہاگنیں، پچھل پیریوں کی مانند ڈرتی ہیں۔

”مہاراج“

سامنے کول کھڑی تھی، چھوٹی سی بالیکہ، پوترتا کا چتر، بال و دودا

ملگجی ساڑھی کی ہکل میں لپٹی، آنکھیں جھکائے، وہ اناج دے رہی تھی۔ اناج لے کر اس نے جھک کر اس کے میلے چرنوں کو پرنام کیا، اس نے گھبرا کر پیر پیچھے کھینچ لیے۔

”مہاراج مجھ پاپن کو....“

”دیکھی رہو“

وہ جب بھی اس بال و دودا کو دیکھتے من میں کٹاری اترتی محسوس کرتے، یہ یہاں سب سے دور و دودا باڑے میں جنم کو چتا بنائے ہے۔

”ہے پر بھو“ دکھ سے سوچا۔ بے چاری ابلا“

بال و دودا قدموں میں جھکی تو آشیر باد دی۔

”بھگوان کلیان کرے۔“

وہ دیر تک چوکھٹ پر سرٹکائے بڑی بڑی بھنورا آنکھوں سے مہاراج کو جاتے دکائی۔

”اتی سندراتی سندرا!“ من پنچھی باورا ہو کر چھپایا، لامباقد چوڑے شانے دھلا رنگ چوڑا ماتھا، سیاہ چمکیلے بال، رحم اور ہمدردی سے چھلکتی آنکھوں کی گائیں۔

”اتی سندراتی سندرا“

نمین نیا نیر سا گر میں ڈوبی جائے۔ ہاتھ جوڑ کر ان کی پشت کو پر نام کیا۔

وچاروں سے چونکا تو خود کو ویشیا نگر میں پایا جہاں وہ کبھی بھی نہ آیا تھا، مگر عجب اور نامانوس باس نے عجب اور انجانی جگہ کا احساس کرا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ دیئے جلنے کا سہ ہے اب واپس ہونا چاہیے وہ خود کو قدرے خوفزدہ پارہا تھا۔ شکنتی کے لیے جینو کو چھو، خود کو سمجھا یا برہمن ہوں، اتنے بڑے گرو کا چیلہ مجھے ڈر کا ہے کا ان نرمل ناریوں کا؟ یہ ویشیا جو خود بھی ایک طرح سے دودا ہی ہیں۔ پرش ہیں مگر پتی پر میثور نہیں۔

ادھر ادھر دیکھا ویشیا نگر اجڑا سا لگا۔ شاید اندر بند کواڑوں پیچھے وہ جوڑوں کو گجروں سے جا رہی ہوں گی، پھولوں سے بستر ڈھانپ رہی ہوں گی۔ ہونٹوں کو لالی سے تیز کر رہی ہوں گی اور آنکھوں میں کا جل کی کٹاری چھپا رہی ہوں گی۔ اسے بند کواڑوں پیچھے ماؤس جیسا گھورا اندھیارا محسوس ہو رہا تھا۔

چند گز رنے والوں نے اسے شب کی نظر سے دیکھا، ایک دو نے نمسکار کیا، بعض نے ہنس کر دیکھا اور کھکھارے، جب کہ کچھ نے فقرہ بھی جڑ دیا۔ مگر وہ سب سے لاطلق کھڑا تھا، عین راہ میں۔ تو یہ ہے ویشیا! بہت دیکھ لیا، اب واپسی کی ٹھانوی۔

وہ جانے کو مڑا اور عین اسی سے بولائی ہوائے گھونگھٹ کی مانند کھڑکی کے پٹ کھول دیئے تو چوکھٹ میں وہ چتر کی مانند تھی، کسی مہان کلاکار کا چتر، سیاہ بالوں کی آبشار میں اشان کرتے میدے کے بنے پنڈے میں سے اندر دھنش کے سب رنگ جنم لے رہے تھے۔ دہکتے جوالا سماں اور اسی سریر جوالا میں نار پھل۔ گویا اندر دھنش کے سب رنگ زندہ ہو کر دائروں میں ڈھل گئے ہوں۔ کمرہ میں اجالا سریر کا تھا کہ دیے کا؟

یقیناً منیہ کلا نے دوسرا جنم لیا تھا۔

”اوئی دیا“ وہ سر جھٹک کر کھڑکی اور پکی۔

تب دونوں نے پہلی مرتبہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”ہے پر بھو“ کہنے کے لیے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے مگر ان میں سے کوئی شبد نکل نہ سکا۔ وہ اماوس نمین کے گھور بھنور میں ڈوب رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑا کر چوکھٹ تھام لی۔ وہ ٹھٹھکی کمرہ بیچ کھڑی تھی۔ چادر کی اور بڑھنے والا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہا گیا۔

”اوئی دیا“ اب لہجہ میں صرف اچنبھا تھا۔

آنکھیں انگ رکھ کر چمچی بن گئی تھیں۔ ڈال ڈال پات پات گھونسلے کی کھوج میں! اماوس نمین اسے آنک رہے تھے۔

منہ کے گلاب پر مسکان کی تتلی!

وہ ایک ادا سے نیچے جھکی، گرمی چادر اٹھا کر سب کچھ اس میں چھپا لیا، بالوں کی آبشار اندر دھنشن کے رنگ، میدہ کا پنڈا اور نار پھل اس نے سریوں جھٹکا دیا گویا نظریں جھٹک رہا ہو۔ ریڑھ کی ہڈی سے گرمی کی جولہ چلی تو تن جوالا کی راکھ انگ انگ میں بکھر گئی۔ ٹانگوں نے سریر کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا، ڈمگایا تو چوکھٹ کو اور بھی سختی سے تھام لیا اور ساتھ ہی آنکھیں موند لیں۔

سے کا پکھیر و آتما پر منڈلا رہا تھا کہ لمبی اڑان کو نکل گیا؟ کچھ خبر نہ تھی۔

اس کے سامنے گویا جوالا اکھی آ گیا، گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ سر سے پیر تک سفید چادر میں لپیٹی کھڑی اسی کو کمر کر دیکھ رہی تھی وہ کپکپاتے ہاتھ جوڑ کر پرار تھنا کے انداز میں بولا۔ ”دیوی شاکرنا۔“

وہ اس کے بہت قریب آ گئی، گرم سانس اس کے تپتے چہرہ پر گویا پٹکھا کر رہی تھی۔

”کا ہے کی؟“ نمین برت سے بولی۔

”اسی کی“ زبان شبد نہ ادا کر پا رہی تھی۔

”کا ہے کی؟“ مسکان کی رسان سے پوچھا۔

انگ کی گرمی سے چوکھٹ نے اب تک دھواں نہ دے دیا تو اچنبھے کی بات تھی۔ اس نے خشک پھڑپھڑائے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں ترک کیا، وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ پوری شکتی سے، مگر شکتی اب کہاں؟ وہ تومانی کی ڈھیری میں تبدیل ہو چکا تھا۔

وہ اس کے منہ کے قریب منہ کر کے بولی۔ ”آؤ“

وہ خاموشی سے تکتا رہ گیا۔

اس نے پھر ہونٹوں کی جوالا کانوں میں انڈیلی۔ ”آؤنا“

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”دیوی..... مجھے شاکر دو۔“

اتنی سی بات کہہ کر وہ جیسے ہانپ گیا۔

”دیوی!“ جوالا ہنسی۔ ”ہم دیوی دیوی نہیں ہم تو بس.....“

اس نے ہنس کر بات ادھوری چھوڑ دی، پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔

”مہاراج! پوتر چرن ایک ویشیا کے گھر ناہیں رکھیں گے؟“

”ویشیا؟“ اس نے یوں دہرایا گویا یہ شہد نہیں کوئی نیا پھل ہو۔

اگلے لمحے وہ دروازہ کھول کر اس کے ساتھ کھڑی تھی اس کے سر پر سے اٹھتی گرم گرم نانا نوس اور اچنبھے میں ڈالنے والی باس ہوش

ہرن کئے دے رہے تھی۔ وہ اس کا ٹھنڈا بازو پکڑ کر سرگوشی کے لہجہ میں بولی۔ ”پدھاریئے“

وہ کسی بچہ کی مانند اس کے گرم ہاتھ میں اپنا ٹھنڈا پسینہ میں بھینکا ہاتھ دیئے چل پڑا۔ پل بھر کو دبلیز پر رکا مگر پھر اس پار۔

”گرود یوناری کیا ہے؟“

”مستی کا شراب۔“

”گرود یوناری کیا ہے؟“

”بھاوناؤں کی پاتال“

”گرود یوناری کیا ہے؟“

”شکتی کا شمشان“

”اور پھر بھی.....؟“

”ہاں پھر بھی!“

”پرنتو.....“

”جل جوالا سے دور رہ کر اپنی شکتی کا کیسے پالن کر سکتا ہے؟“

”گویا بھوگ پر کشا ہے۔“

”بالکل! مگر بھوگ جل اور جوالا کا ہو جوالا اور کاٹھ کا نہیں۔“ گرو دیو خاموش ہو گئے، چیلے نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا، گرو دیو کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے سوچ رہا، بارے گرو دیو بولے۔

”شکتی شالی منش بھوگ کی پر کشا میں پھسل رہتا ہے پر نتو ناری کے یدھ میں وجے اسی پرش کو پراپت ہوتی ہے جو اپنی جوالا کے لیے ناری کی جوالا کو جل بنالینے کی شکتی رکھتا ہو۔“

”ورنہ؟“

”ورنہ وہ بھوگ کے شمشان کا ایندھن بنے گا۔“ گرو دیو کے سریر میں کپکپی کی لہر دوڑ گئی پھر وہ خود پر قابو پا کر بولے۔ ”ہاں وہ ناری کی چتا کی لکڑی بن جائے گا بلکہ اپنی شکتی کی چتا کی لکڑی بھی بن جائے گا۔“

وہ رک گئے گویا چڑھائی کے بعد سانس لے رہے ہوں۔ ”ایک مرتبہ شکتی گنوا بیٹھا تو جیون بھر اسی چولہے کی لکڑی بنا رہے گا۔“ وہ ایک مرتبہ پھر رک گئے اور تب قطعی لہجے میں بولے۔ ”ہاں، عمر بھر ناری کے چولہے میں جلے گا، جلتا رہے گا۔ چولہا کبھی ٹھنڈا ہی نہ ہو گا۔“ سرگوشی میں جیسے خود کو یقین دلا رہے ہوں۔ ”یہ چولہا ٹھنڈا ہونی نہیں سکتا۔“

اب سہایتا کو گرو دیو موجود نہ تھے۔

اب دوسری دنیا میں تھا۔ پر بت، بادل، گلہری، موتیا، موگرا، ہرن کا بچہ، کئی اور گرو دیو یہ سب کسی اور جنم کی کتھا میں تھے۔ اب وہ ایک ویشیا کے کمرہ..... اس کی دنیا میں تھا۔ ہر چیز انوکھی تھی، حتیٰ کہ بات بھی!

”مہاراج آپ کیا کرتے ہیں؟“

”سمیان“

”کا ہے کو؟“

”سریر پوتر کرنے کو۔“

”اور.....“

”آتما پوتر کرنے کو۔“

”اور.....“

”بدھی مان بننے کو۔“

”سریر پوتر کرنے کو! آتما پوتر کرنے کو! بدھی مان بننے کو!.....“ یہ سب دہرا کر اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ”یہ سب کا ہے کو؟“

وہ اسے سمجھا تا رہا اب وہ اس سے کھل کر بات کر رہا تھا۔ گرو دیو سے جو سیکھا تھا سب بیان کر دیا۔ وہ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں پوری کی پوری کھولے بڑے غور سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس کے ادھ کھلے ہونٹ انار کے دانوں جیسی چمکیلی سرخی لیے تھے اور ان کے پیچھے سفید دانتوں کے چمکیلے موتی۔ وہ ہڑبڑا کر چپ ہو گیا۔ وہ اسے دیکھتی رہی پھر لمبی سانس لے کر پوچھا۔ ”گرو دیو نے کتھاؤں کے بارے میں نہیں بتایا۔“

”کتھا میں؟ نہیں تو؟“

”گویا کتھا سرت ساگر، پنج تنتر اور بیتال کتھاؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں، مگر ہمیں کتھاؤں سے کیا۔“ وہ زور دے کر بولی۔ ”بہت کچھ لینا ہے بدھی، وچار، کلپنا، کلشا“ اس نے سر جھکا لیا مگر آنکھیں یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکیں کہ جوش میں بولنے سے گال سرخ سرخ ہو رہے تھے۔

”جب کتھا کا نہیں جانتے تو پھر نائک اور رس کے بارے میں بھی جانکاری نہ ہوگی۔“

”ہم برہم چاری ہیں نائک اور رس سے کیا لینا۔“

”کیوں؟“

”نائک بھی تو مایا ہی ہے..... ہے نا؟“

”کا ہے؟“

اس نے سمجھایا۔ ”یہ رنگ منج کا ٹونا ہے۔ جل نہیں پرنتو جل دکھاتے ہیں، لو بھ نہیں مگر لو بھ دکھاتے، بھاؤنا نہیں مگر بھاؤنا پیدا کرتے ہیں۔“

وہ کچھ دیر تک چپ رہی پھر گھمبیرتا سے بولی۔ ”مہاراج! نائک و دیا دھرتی و دیا ہے، کلپنا کی و دیا ہے، پرا کرتی کی و دیا ہے۔“ وہ رک کر اسے غور سے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ”نائک کے و دوانوں نے نائک سے حاصل ہونے والے جس رس کا ذکر کیا ہے اسے بھی نہیں جانتے ہوں گے پھر تو۔“

”ہمیں انہیں جاننے کی اچھا ہی نہیں۔“

”اچھا ہونی چاہیے۔“ اس کے گال پھر سے سرخ ہو رہے تھے۔ ”مہاراج! اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہاراج کو شیر نگار رس کا تو بالکل ہی نہیں معلوم ہوگا۔“

”نہیں تو۔“

”حالانکہ یہ آری رس ہے۔ نانک یہ کرتا ہے کہ وہ ہم میں رتی رس پیدا کر کے نیند میں ڈوبے انگ میں پریرنا پیدا کرتا ہے۔“ اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ بات مہاراج تک نہیں پہنچی کہنے لگی۔ ”کاش مہاراج نے شکنتلا نانک یا میگھ دوت دیکھا ہوتا۔ تو میری بات سمجھ پاتے۔“

وہ جیسے چڑ کر بولا۔ ”میں نے کہا نا کہ ہمیں رنگ منچ کے جھوٹے جادو اور نانک یا نانک کی جھوٹی پریرنا سے کیا لینا؟“ وہ اسے رحم بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شما کیجئے مہاراج! آپ تو جزیرہ بنے جیون ساگر سے الگ تھلگ ہیں پھر شما کیجئے مہاراج! آپ تو جیون رس ہی سے محروم ہیں پھر کاہے کو قسیا اور کیا گیان؟“

اس نے بولنا چاہا مگر وہ بے صبری سے بات کاٹ کر بولی۔ ”مہاراج ناری رس بنا گیان بھی اگیان ہے۔ ناری رس بنا ساری قسیا بھنگ ہو جاتی ہے اور ناری رس بنا بدھی مان بھی بدھو مان بلکہ مانف بن جاتا ہے۔“

”جیون رس ناری رس یہ سب کیا ہے؟“

وہ بے حد سنجیدگی سے اسے سمجھانے لگی۔ ”مہاراج! آپ نے جیون کا ایک روپ دیکھا ہے۔ آپ کو کسی گرو نے یہ شکشا ہی نہیں دی کہ ناری ہی گیان ہے اور ناری ہی قسیا ہے اور ناری ہی بدھی ہے اور یہ جانے بغیر گویا آپ کچے گڑھے پر جیون ساگر پار اترنا چاہتے ہیں۔“ اس کی آنکھوں کے اماؤں میں جگنو سے چمک رہے تھے گال سرخ ہو رہے تھے چادر سرکتی جا رہی تھی۔ ”ناری رس ہی میں جیون رس ہے مہاراج!“ چادر گرنے کو تھی۔ ”ایک گنواں کو یہ شکشا مجھ ایسی ہی دے سکتی ہے۔“

اس نے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

”آؤ اپنے نئے گرو کے پاس انمول شکشا بن مول آؤ ڈرومت! اسی جوالا میں جل کا انت ملے گا۔“

اور وہ کچھمن ریکھا لانگ گیا۔

صبح پہنچا تو مہاراج کئی کے باہر پتھر پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ وہ ان کے سامنے جا کر منہ کے بل زمین پر لیٹ گیا۔ ”شما! شما گرو

دیو، شتا“

آنسو بہہ کر مٹی میں جذب ہو رہے تھے۔

اب اس نے دیکھا وہ پتھر پر چاقو کی دھار تیز کر رہے تھے۔ انہوں نے پتھر پر تھوڑا سا پانی چھڑکا اور رگڑنا جاری رکھا۔
”شتا، گرو دیو شتا“

وہ خاموشی سے مصروف رہے پھر اس کی آنسو بھری آنکھوں نے دھار کی چمک دیکھی، اس نے سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں اگر پران دے کر پرانچیت ہو سکتا ہے تو سودا مہنگا نہیں تھا۔

گرو دیو بولے۔ ”اٹھو“

وہ خاموشی سے اسے دیکھتے رہے..... دیکھتے رہے، نظریں اس کے آر پار ہو رہی تھیں، اندر اتر رہی تھیں۔ وہ دیکھتے رہے۔
پھر بولے۔ ”تم جانتے ہو یا شاید نہیں جانتے، بن مول شکشا نہیں ملتی۔“

وہ خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ اس کا جھکا سر دیکھتے رہے، پھر بولے۔ ”اس لیے چیلے سے شکشا سے گرو دکشنا لی جاتی ہے۔
میں سمجھتا ہوں کہ سے آ گیا ہے کہ تم سے بھی گرو دکشنا مانگی جائے۔“ وہ رک گئے۔ اس نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ”تیار ہو“
وہ ہاتھ جوڑ کر بمشکل بولا۔ ”گرو دیو“

گرو دیو نے چاقو اس کے ہاتھ میں دے دیا جس کی تازہ دھار پر سورج کی ایک کرن ناچ رہی تھی، اس نے خاموشی سے چاقو ہاتھ میں لے لیا، گرو اور چیلہ ایک دوسرے کی آنکھیں پڑھ رہے تھے، تب گرو دیو نے انگ کا کپڑا اتار پھینکا۔ ”دیکھ، میری اور دیکھ۔ یہی ہے گرو دکشنا“

دھک کی لہروں سے اس کا سر یرسوکھے پتے کی طرح ڈول رہا تھا۔ کیسے بتائے گرو دیو کو، یہ دکشنا تو وہ کسی اور کو دے آیا ہے۔ اب دینے کو کیا بچا؟



ہراک خواہش پہ.....

ہر وہ جانور جو انسان کی خدمت میں آجائے، حق خدمت ادا کرتا ہے، ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر۔ مٹھی بھر دانہ اور سوکھی سڑی گھاس پر عمر گزار لیتا ہے، خدمت کرتے کرتے فنا ہو جاتا ہے۔ مالک کو کبھی بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کارآمد جانور بھی جاندار ہے، اس کے لیے کس کس طرح سے ہلکان ہوتا ہے۔ نہ خدمت کی قدر نہ محنت کا اجراء نہ کام کی عزت اور آخری ذلت یہ کہ مرنے لگے تو ذبح کر کے کھالیا۔ جسے کھانہ سکے اس کی کھال بچ کھائی۔

آج صبح سے ہی دھوبی کے گدھے کے دل میں کچھ اس قسم کے یاس انگیز خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ دھوبی منوں کپڑے لاد کر لایا تھا اور اب ندی کنارے بیٹھا۔ ”چھو چھو“ کر رہا تھا۔ اس نے دھوبی کے نام پر باریک سا کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ دھوپ میں پسینہ بھری سیاہ کمرچک رہی تھی۔ گدھے کا جی چاہا، ایک دولتی جھاڑ کر اسے ندی میں گرا دے۔ کبھی باہر نہ نکلنے کے لیے۔ ویسے تو گدھے کو مالک ہمیشہ ہی ناپسند تھا مگر آج تو حد ہو گئی۔ جی تو اس کا دل غم و غصہ سے بھرا تھا۔ دھوبی نے بچوں کو دودھ پلانے کے لیے جو بکری پال رکھی تھی وہ اب ناکارہ ہو چکی تھی۔ بجائے اس کے کہ خدمت کے صلے میں اسے بقیہ عمر آرام سے کھانے دیتا، آج صبح اسے قصائی کے حوالے کر دیا۔ قصائی کے روپ میں آنے والی موت کو دیکھ کر بکری جس طرح میائی، گدھے کے کان میں ابھی تک اس کی درد بھری پکار گونج رہی تھی۔

دو پہر کا سورج سر پر چمکے جا رہا تھا۔ ہوا میں حدت ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ البتہ ندی سے آنے والا کوئی جھونکا تازگی ساتھ لاتا، مگر وہ بھی یوں گویا پھٹی جھولی میں لا رہا ہو۔ موسم ہر لحاظ سے بیزار کر دینے والا تھا مگر گدھے کے لیے تو باہر کے مقابلے میں اندر کا موسم کہیں زیادہ خراب تھا۔ بکری کی مانند اسے اپنا انجام بھی اچھا نظر نہ آ رہا تھا۔ کیا بنے گا میرا؟ گدھے نے افسردگی سے سوچا۔ میری عمر بھی تو خاصی ہو چکی ہے۔ پہلے اسے لادی بوجھ نہ محسوس ہوتی تھی، تب وہ گویا اڑا جاتا مگر اب تو گویا کمر ہی ٹوٹ چکی ہو۔ بعض اوقات ٹانگیں ڈگمگانے لگتیں۔ دو چار مرتبہ تولو کھڑا کر گر بھی چکا تھا جس پر اس کی خاصی پٹائی بھی ہوئی تھی۔ دھوبی نے اسے چرنے کے لیے چھوڑ رکھا تھا۔ آج تو ہری ہری گھاس بھی نہ بھاری تھی۔ گویا بھوک اڑ گئی ہو۔ گدھے نے دکھی دل سے آہ بھری!

وہ اپنی ہی سوچوں میں الجھا آہستہ آہستہ چلتا گیا اور پھر اچانک خود کو دھوبی کے مندر کے سامنے پایا۔ گدھا اس مندر سے واقف تھا

کہ دھوبی پجاری کے کپڑے دینے آتا تھا۔ گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور طرح طرح کے پھولوں کے مہکتے رنگوں کے درمیان یہ چھوٹا سا مندر واقع تھا۔ سامنے استھان پر دیوتا، مور کی گردن کے رنگ والا بالوں میں چاند سجائے، گلے میں ناگ کی مالا ڈالے، تیسری آنکھ والا شیو گویا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ گدھے نے سوگوار آنکھوں سے دیوتا کو دیکھا اور اب اسے یقین ہو گیا کہ واقعی دیوتا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ تیسری آنکھ سے نکلتی روشنی کی لہریں گدھے کے غمگین دل میں اجالا کر رہی تھیں۔ اسے عجب سکون کا احساس ہو رہا تھا جس کی وجہ سے دل نرا شا کی مٹھی سے گویا آزاد ہو گیا۔ اس نے بڑی بڑی سوگوار آنکھوں سے دیوتا کو دیکھا اور سر جھکا دیا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے مگر اسے زبان سے درد دل کا ماجرا بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ دیوتا انتریا می تھا۔ ویسے بھی آج تک کسی پجاری سے اسے سچے آنسوؤں کی بھیٹ نہ ملی تھی۔ دیوتا نے اپنے دل میں گدھے کے ورد کی پیڑا محسوس کی اور یہ بڑی بات تھی۔ وہ صدیوں سے پرارتھنا کا عادی تھا اسی لیے بھجن اثر نہ کرتے۔ وہ بنتی کرنے والوں کی خواہشات اور تمنائوں سے لاتعلقی رہتا، اب تو ان سب سے اس کا جی اوبھ چکا تھا اس لیے وہ دنیا اور دنیا والوں کے معاملات سے بیزار ہو چکا تھا مگر گدھے کے سچے آنسوؤں نے پتھر من پگھلا دیا۔

دیوتا نے بڑے پیار سے اسے پکارا۔

گدھے نے لے لے کان ہلا کر تعجب سے، آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ دیوتا کے چہرے پر شانت مسکان اور آواز میں شہد تھا۔

”کیا بہت نراش ہو؟“

”آپ تو انتریا می ہیں۔“ گدھے نے عاجزی سے کہا۔ اسے توقع نہ تھی کہ اتنا بڑا دیوتا اس جیسے دھوبی کی لادی اٹھانے والے حقیر جانور سے بھی مخاطب ہو سکتا ہے۔

”ہاں میں تمہارے دکھ کا کارن جانتا ہوں۔“

”تو پھر کرپا کیجئے پر بھو“

”تم بہت اچھے اور محنتی ہو۔ تم نے جی جان سے مالک کی خدمت کی ہے۔“

”یہی تو دکھ کا کارن ہے پر بھو“ گدھے نے فریاد کی۔ ”کل کو میرا بھی برا حال ہوگا۔“

”یہ تو ہے۔“ دیوتا پر خیال انداز میں بولا۔ ”یہ تو ہوگا۔“

”جی؟..... میں کچھ سمجھا نہیں۔“

دیوتا نے دیوتاؤں جیسی مدھر مسکراہٹ سے پوچھا۔ ”ابھی ابھی تم نے کہا تھا کہ ہم انٹریامی ہیں، ہیں نا؟“
 ”وہ تو ہیں۔“

”تو پھر جو کچھ جس طرح ہے اسے اسی طرح رہنے دو۔“
 ”پر بھو! میں اس دنیا کو تبدیل نہیں کرنا چاہتا..... چاہتا کیا.....“
 ”میں چاہوں بھی تو کچھ نہیں کر سکتا، محض ایک گدھا!“
 ”مگر تم خود کو تو بدلنا چاہتے ہو..... ہے نا؟“
 ”ہے پر بھو!“

دیوتا آنکھوں میں نرمی لیے میٹھی مسکان سے اسے دیکھا کیا۔ ”آپ نے من کی اچھا جان لی ہے پر بھو! گدھا عاجزی سے بولا۔
 ”میں اس جیون سے تنگ آ چکا ہوں۔“
 ”کیوں؟“

”یہ بھی کوئی جیون ہے پر بھو! کتنا بھی مجھ سے بہتر ہے، وہ بھونک تو سکتا ہے۔ میں تو اس قابل بھی نہیں۔ نہ جانے کس جنم کے پاپ
 بھگت رہا ہوں۔“

دیوتا نے انگلی کے اشارے سے اسے خاموش کیا۔ ”یہ پچھلے جنم کے پاپ کے کارن نہیں، تم سدا سے گدھے ہی تھے۔“
 ”یہ سن کر گدھا مزید رویا۔“ تو کیا اب میری مکتی نہ ہوگی؟“

”ہوگی ہوگی،“ دیوتا رساں سے بولا۔ ”اگر یہی اچھا ہے تمہاری تو ضروری ہوگی۔“
 ”تو پر بھو! مجھ ابھاگے پر کر پا کر دو۔ میرا جیوان کھل کر دو۔“

دیوتا نے تیسری آنکھ میچ لی، شاید وہ آنے والے زمانوں کے بارے میں وچار کر رہا تھا۔ گدھا اس دوران دب دہے میں سر جھکائے
 کھڑا ہوا، ایک پل یا ایک صدی بعد دیوتا نے تیسری آنکھ کھولی۔ گدھے کو دیکھا۔ ”سنو! میں تمہیں تین جیون دیتا ہوں۔“
 گدھا خوشی سے رو دیا۔ ”پر بھو! میرے لیے تو ایک ہی جیون کافی ہوگا۔“

”نہیں، تم اس جیون کے عادی ہو چکے ہو، ہو سکتا ہے کہ نیا جیون اس نہ آئے۔“

گدھا کہنا چاہتا تھا کہ گدھے کے مقابلے میں ہر جیون ہی بہتر ہوگا مگر دیوتا کے ڈر سے نہ بولا۔ مگر دیوتا، کہ انٹریامی تھا، من کی

بات جان کر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ”کوئی بات نہیں۔ بہر حال تمہیں تین جیون ارپن ہیں، نہیں سویکا کرو۔“
 ”جے پر بھوکی جے ہو“

چار کے بعد دونوں پر جسم کا بوجھ ڈال کر کھڑا ہونے کا تجربہ حیرت ناک بھی تھا اور خوشگوار بھی۔ جھکی رہنے والی گردن اب تنی ہوئی تھی۔ ہر حرکت کے ساتھ منھوس آواز میں بچ اٹھنے والی پیتل کی غلیظ گھنٹی سے بھی جان چھوٹی۔ یہ گھنٹی گدھے پن کی علامت تھی۔ اس لیے وہ اس سے بے حد متنفر تھا۔ گھنٹی کے بغیر گردن سبک محسوس ہو رہی تھی۔ زمین کی طرف جھکی رہنے والی آنکھیں اب دور بہت دور افق تک دیکھ سکتی تھیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ منہ اٹھا کر آسمان بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ اسے ہرگز یہ اندازہ نہ تھا کہ آسمان کا نیلا رنگ کیسا من بھاونانہ درختوں کے سبز پتوں کی ہریالی کیسی شانت کرنے والی اور پھولوں کے سفید سرخ زرد رنگ ہر دے میں کیسی بھاونانہ پیدا کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ مرد بن کر بے حد خوش تھا۔ اگر مانگ کر دوسری جون لینی تھی تو مرد کی جون سے بہتر اور کون سی جون بہتر ہو سکتی تھی، کون کہتا ہے گدھا بیوقوف ہوتا ہے۔

اس نے پیار سے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ کھلا سینہ طاقتور بازو مضبوط رانیں۔ اس نے دل میں دیوتا کا شکریہ ادا کیا جس نے اسے ایک طاقتور مرد کا جیون دان میں دے دیا۔ اگر وہ روگی مرد بنادیتا تو میں کیا کر لیتا۔ اسے اندازہ تھا کہ ہونٹوں پر مدھر مسکان لیے دیوتا اسے تیسری آنکھ سے دیکھ رہا ہوگا۔ سو اس نے سر جھکا کر دیوتا کو پر نام کیا۔

اس نے ہونٹ بھیجنے کر اور آنکھیں سکیڑ کر احتیاط سے قدم اٹھایا۔ وہ چار ٹانگوں پر چلنے کا عادی تھا مگر اب دو پر چلنا عجب سا لگ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ڈگمگا کر منہ کے بل گرے گا، مگر نہیں وہ سلامتی سے چلتا رہا۔ اس نے خوشی سے دونوں بازو پھیلا دیئے تو یوں محسوس ہوا گویا بازو افق تا افق پھیلتے جائیں گے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر دیوتا کو پر نام کیا۔

وہ بچے کی مانند خوش خوش دوڑتا رہا، قلابازیاں لگا تا رہا، اچھل کود کرتا رہا۔ جسم تھا مگر من نہ بھرا۔ اس نے بستی کا رخ کیا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ دوسرے مردوں کے ساتھ وہ کیسا مرد لگتا ہے، مگر بستی کے دروازے پر ہی دھر لیا گیا۔

”ابے ادھر آ“

اس نے چونک کر تعجب سے دیکھا۔ اسے آواز دینے والا کون ہو سکتا ہے۔ اسے آواز دینے والے کو تو والی کے سپاہی تھے۔
 ”میں؟“

”ہاں ہاں“ وہ بے صبری سے بولے۔ ”ادھر آ“

”کون ہے تو؟“ قریب جانے پر ان میں سے ایک نے پوچھا۔

”میں میں“ وہ کیا بتاتا کہ وہ تو سابق گدھا ہے۔

”گدھر سے آیا؟ ادھر کدھر جاتا ہے؟“

وہ خوف بھری خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

”بولتا کیوں نہیں ہے؟“

انہوں نے اسے پکڑا اور لے گئے کوتوال کے پاس جس نے اس کی آئیں بائیں شاخیں سن کر خاصی چھتروں کی اور پھر بندی خانے میں ڈال دیا جہاں اس جیسے اور بھی کئی جنے تھے۔ اس کے جسم پر مار سے نیل پڑ گئے تھے اور پنڈا پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ مرد بننے ہی بے بھاؤ کی پڑیں۔ اب کیا کروں اس نے بے بسی سے سوچا۔ پتہ نہیں اس بندی خانے میں دیوتا اسے دیکھ رہا ہے یا نہیں اس نے پریشانی سے سوچا۔ غالباً نہیں۔ اسے مرد کا جیون دینے کے بعد دیوتا کا کام ختم ہو گیا تھا۔ اب اسے اس کے جسم کی ٹیسوں اور نیل سے کیا لینا!

صبح سویرے سنتری آئے اور ان سب کو لے چلے ہانک کر۔

راجہ کے پتا سورگباشی ہو گئے تھے۔ ان کا مقبرہ بن رہا تھا اور بیگار میں سینکڑوں مرد پکڑے جا چکے تھے۔ صبح سے شام تک کام۔ رات کو موٹا جھوٹا دے کر انہیں بند کر دیا جاتا، صبح کو پھر وہی کام۔ کام کی ہلکی رفتار پر گالیاں، جوتیاں، لاتیں اور کام بگڑنے پر گالیاں، جوتیاں، لاتیں، بلکہ کبھی کبھی تو شوقیہ بھی گالیاں، جوتیاں، لاتیں!

کبھی کبھی سوچتا راجہ کے سورگباشی پتا کا مقبرہ جلد تیار ہو جائے اور وہ اس عذاب سے مکت ہو جائے گا مگر کام تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہ آ رہا تھا۔ تاہم اس نے دل میں آس کا دیار روشن رکھا۔ اچھا تو پوری ہوئی مگر کس برے طریقے سے۔ شام کو تھکے ہارے آتے تو کوئی کسی سے بات کا روادار نہ ہوتا تھا۔ ہر مرد اپنے دکھا کا اسیر، ہر مرد اپنے درد کے جزیرے کا باسی۔ کسی کے پاس ہمدردی کا مرہم ثابت ہونے والے دو بول بھی نہ تھے۔

ایک رات جب پنڈا بخار سے تپ رہا تھا اور جسم محنت کے پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور خوراک سے خالی معدہ زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑا رہا تھا، اس نے سوچا برداشت کی بھی حد ہوتی ہے اور صبر کے ساگر کا بھی کنارہ چلو بھاگو جان بچالو۔ ورنہ ایک دن مارا جاؤں گا، کسی کو میرے مرنے کی خبر بھی نہ ہوگی، جس طرح مجھے میرے پڑوسیوں کے مرنے کی اطلاع نہ ملی۔ راہ فرار کے پہلے قدم پر ہی

دھریا گیا۔ ”گردن مار دو حرامی کام چور کی۔“

اور عین گردن اڑائے جانے کے سے میں اس نے دیوتا کو یاد کیا۔

سیاہ بھونرائیں سانولی کاروپ سہانا من لبھانے کو ہونٹوں سے لالی کارس ٹپکنے کو لاہے سیاہ بال کمر کے نیچے ابھارتک پہنچے کو دھرا سے بھری کنورا چھاتیاں انگلیا سے باہر آنے کو میدے جیسے لوج والے پیٹ میں ناف کا بھنور تیل کی پٹی پی جانے کو!

ندی کے شیتل جل میں مکھڑا دیکھ اپنی چکور بنی!

”ہائے رام! میں اتنی سندر تار؟“ اس نے اچنبھے بھرے نین پورے کھول کر جل کے آئینے میں جھانکا ’من ہی من میں دیوتا کو ڈنڈوت کی جس نے اسے مرد کی جون میں گدھے کی زندگی بسر کرنے اور حرام موت سے بچا لیا تھا۔ دیوتا نے نہ صرف یہ کہ اس کی دوسری اچھا پوری کردی تھی بلکہ اس کی توقع سے بھی بڑھ کر خوبصورت طریقے سے۔ دیوتا اگر اسے بد صورت یا بوڑھی یا روگی ابلہا بنادیتا تو وہ اس کا کیا کر لیتا۔ ناری بننا بھی بے کار جاتا۔ ناری ہو تو سندر ورنہ گدھا ہی بہتر۔ وہ دل ہی دل میں ہنسا اور دیوتا کو پر نام کیا۔ جو یقیناً کیلاش میں بیٹھا اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہوگا۔

بازو ہلائے تو نگن کھٹکے پاؤں اٹھایا تو پائل نے تال دی چلی تو سینے کے ابھار پرست لڑا لرزا..... ادھر ادھر نگاہ ڈالی تو خود کو غیر آباد علاقے میں پایا۔ یہاں سے چلنا چاہیے یہ جی میں ٹھانی اور چلی۔

”اے پتیا!“

وہ نہ سمجھی کہ اسے زرخے میں لیے مرد کیا کہہ رہے ہیں سو بڑبڑ دیکھتی رہ گئی۔

”ابے یہ تو کچنی دکھے ہے۔“

وہ انہیں اور ان کے ارادوں کو بھانپ کر بولی۔ ”ہم ایسی ویسی ناہیں“

”تم یہ ناہیں تو پھر کیا بلا ہو؟“

”یہ روپ“

”یہ لٹے“

”یہ گہنے“

”اور یہ.....“ وہ ایک ایک کر کے اس کا انگ چھونے لگے۔

مدد کے لیے چلانا چاہا مگر خوف سے حلق خشک ہو گیا۔ چیخنے کو منہ کھولا مگر آواز نہ نکلی۔ انہوں نے دہشت سے اکڑے جسم کو اٹھالیا اور لے گئے اس چھتار میں، جہاں کڑی دھوپ نہ پہنچ سکتی تھی، دن کو بھی جھپٹے کا سماں ہوتا ہے، جہاں درختوں سے گھنی بلیں لپٹی رہتیں، پھولوں کے رنگ خوشبو بن کر مہکتے اور پرندے شاداب شاخوں پر بسرام کرتے۔ مگر اس لمحے چیخوں سے ڈر کر سب اڑ گئے۔ لباس کے ساتھ اس کا رنگ اور انگ کے ساتھ آتما بھی تار تار ہو گئی۔

”ہے پر بھو!“ اس نے بے بسی سے سوچا۔ ”میرا کیا دوش؟ کیا گدھے کا جسم چھوڑنے کی سزا مل رہی ہے۔ میں گدھا تھا مگر میری آتما تو گدھے کی نہ تھی، نہ پرشن بن کر سکھ ملا اور نہ ہی استری کا جیون راس آیا، تو پھر اب.....“

پہاڑی پر بل کھاتے راستے جب مندر پر جا کر ختم ہوتے تو یا تری کے تن، من میں شانتی کی لہر دوڑ جاتی۔ درختوں کی گچھا میں چھوٹے سے مندر میں دیوتا کا استھان، سنگی ہونٹوں پر شانتی مکان، پتھریلے نمین محبت کے روشن دیپ اور آشیر باد دینے کو اٹھا ہاتھ۔ سکھ کے اس مندر میں ناگ رام ہو جاتے، بچھوکاز ہر بے اثر ہو جاتا، من کی اچھا پوری ہوتی، باہر ہوا جھاڑو دیتی اور پکھیر و بیٹ نہ کرتے، جالیوں میں سے آتی شعاعیں نکلی اجالتیں۔

دیوتا کا مندر اچانک دریافت ہوا تو اس چتکار سے علاقے کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ غرض مند دور دور سے آنے لگے۔

”میرا پتی میرے بس میں کر دو۔“

”ساس سے میرا پیچھا چھڑا دو۔“

”میرا کاروبار ٹھیک کرادو۔“

”میرے سہاگ کی رکشا کرو۔“

”میرے بیمار بیٹے کو صحت دو۔“

”گائے زیادہ دودھ دینے لگے۔“

”میرے لڑکا پیدا ہو۔“

”میرا بیاہ کرادو۔“

”میرے دشمن کا ستیا ناس ہو۔“

اور اس جیسی لاتعداد خواہشات، چھوٹی چھوٹی، ان کے دل اور آتما جتنی اچھا کیں۔ منت ماننے اور بنتی کرنے والے مندر کے باہر

پراندے کا رنگین دھاگا، رومال، کپڑے کی لیر، سر کے بال یا اور کوئی چیز یاد دہانی کے لیے ارد گرد کے درختوں کی شاخوں سے باندھ جاتے۔ یوں درختوں پر رنگین دھاگوں، کپڑوں کی لیروں اور بالوں کے پھول کھلے رہتے۔

اب دیوتا کے روپ میں تھا مگر اصلی دیوتاؤں والی شکتی کہاں سے لاتا؟ تمام شکتی برہما کے پاس تھی جو ابھی تک اس نئے دیوتا کے جنم سے بے خبر تھا لہذا یہ دن رات سنگی وجود میں قید، غرض مندوں کی بنتی سنتا رہتا۔ باہر درختوں پر رنگین دھاگوں، بالوں اور کپڑوں کی لیروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، حتیٰ کہ کچھ عرصے بعد دل جلوں نے آ کر پہلے بولنا، پھر لڑنا اور پھر کوسنا شروع کر دیا۔

”میرے بیٹے نے تو لگائی کے پیچھے مجھے چھوڑ دیا، اپنی ماما کو۔“

”میری ساس تو پہلے سے بھی زیادہ ظالم ہو گئی ہے۔“

”میرا کاروبار برباد ہو گیا، میں لٹ گیا، کہیں کا نہ رہا۔“

”میرا سہاگ اجڑ گیا۔“

”بیمار بیٹا پر لوک سدھا رہ گیا۔“

”زیادہ دودھ دینے کے بجائے گائے بیمار ہو گئی۔“

”میری کوکھ سے مردہ لڑکے نے جنم لیا۔“

”میرے بیاہ کی بات ٹوٹ گئی۔“

”میرا دشمن سہل رہا۔“

..... یہ کیسا دیوتا ہے، نرا پتھر! پتھر کی مورت کس کام کی۔ ایک دن ایک دل جلے ناسک نے سر پر پتھر دے مارا۔ وہ بلک بلک کر رو یا مگر پتھر کے آنسو نہیں دیکھے جاسکتے، خواہ وہ دیوتا ہی کے کیوں نہ ہوں۔ نہ ہی آتما کے گھاؤ دیکھے جاسکتے ہیں، خواہ وہ دیوتا ہی کی آتما کیوں نہ ہو۔ میں کیا ابھا گا ہوں، جسے نرناری حتیٰ کہ دیوتا کا جیون بھی سہل نہ رہا، تو اب؟ واپس پہلی جون میں چلوا یہی آخری پائے ہے۔

اس نے دیوتا کے حضور گڑ گڑا کر دعا مانگی۔

تاریک مندر روشنی سے جگمگا اٹھا۔ سامنے دیوتا کھڑا تھا، تیسری آنکھ والا انتہائی می!

”میں ناکام دیوتا ثابت ہوا۔“ اس نے فریاد کی۔ ”دنیا والوں کا دکھ درد دور نہ کر سکا۔“ دکھ بھرے لہجے میں اس نے کہا۔ ”اب تو

لوگ منہ پر کونسنے لگے ہیں۔“

”تو؟“

”پر بھو! مجھے یہ پر اے جیون راس نہ آئے۔ میں واپس گدھے کی جون میں جانا چاہتا ہوں۔“

”اسمہو“ دیوتا دو ٹوک لہجے میں بولا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں پر بھو؟“

”احتمل گدھے! کیا تو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتا کہ گدھے سے پرش استری حتیٰ کہ دیوتا بھی بنا جا سکتا ہے مگر دیوتا سے گدھا بننا

ممکن نہیں۔“



سانتا کلاز

جیسے جیسے موسم سرد ہوتا جاتا سردی کے متوازی جسم کی گرمی میں اضافہ ہوتا جاتا اور رگ و پے میں زندگی کی لہر تیز سے تیز تر! پہلی برفباری کے ساتھ ہی وہ پھول کی مانند کھل اٹھتا گویا برس بھر کی مشقت کے بعد بیداری کی راحت حاصل ہو رہی ہو۔ مسلسل برفباری سے زمین سفید کمرل میں چھپ جاتی۔ شاخوں پر برف کی سفید جھالرج جاتی۔ پھولوں کے رنگوں میں سفید حاشیہ کا اضافہ ہو جاتا اور جھیل کی سبز لہروں میں سفید قلمیں گھل مل جاتیں تب افق تا افق سفید زمین سورج کی مہربان دھوپ میں خوشگوار سانس لیتی۔

۲۵ دسمبر، کرمس!

خداوند یسوع مسیح کی دنیا میں آمد کا دن

وہ مسیح جس نے دنیا کے گنہگاروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے صلیب کو خوش آمدید کہا۔ وہ مسیح جس کی پیدائش کی بشارت کا سن کر ہندوستان، ایران اور عراق کے دانا مجوسی یروشلیم پہنچے چرنی میں گھاس کے بستر پر نوزائید کے دیدار سے مشرف ہو کر پر صعوبت طویل سفر کا ثمر حاصل کیا۔ معصوم صورت ماں اور مسرور باپ کو مبارکباد دی، سونا، لوبان اور مر کے تحائف نذر کئے۔ جب وہ شاداں و فرحاں گھر سے نکلے تو آسمان پر تین روشن ستارے یکجا دیکھے۔ ستارے یوں نیچے جھک آئے تھے گویا وہ بھی نجات دہندہ کا دیدار کرنے چاہتے ہوں۔ ان کی ملکوتی روشنی بستی کو نور کا غسل دے رہی تھی۔ اس سے بہتر شگون اور کیا ہو سکتا تھا۔ نجات دہندہ آ گیا تھا اور اسی نجات دہندہ کی آمد کا جشن کرمس کو منایا جاتا ہے۔ مجوسیوں کی ریت میں عزیزوں، دوستوں اور بی خواہوں کو تحائف تقسیم کئے جاتے ہیں، خیر و برکت کی دعائیں دی جاتی ہیں۔ روشنی سے منور کرمس کے شجر میں بچوں کے لیے کھلونے پھلوں کی مانند لگے ہوتے ہیں۔

آج اس کا دن ہے۔ برس بعد اس کی آنکھیں خوشی کی روشنی سے چمکتی ہیں۔ وہ برف کے رنگ کے حاشیہ والا دبیز سرخ چوغہ پہن کر لمبی سرخ ٹوپی میں سر کے گھنے سفید بال چھپا لیتا ہے، روی جیسی داڑھی کے بال بکھرے ہیں، وہ اپنا سرخ تھیلا اٹھا لیتا ہے۔ ایسا تھیلا جس میں بچوں کے خوابوں کی تعبیریں، خوشیوں کے تحائف، آرزوؤں کے گلاب سبھی کچھ ہوتا ہے۔ خیر و برکت والا یہ تھیلا خوشیاں بانٹنے میں کبھی خالی نہیں ہوتا، اس میں سے ہمیشہ تمنا کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور نکل آتا ہے۔ باہر برف گاڑی تیار ہے جس میں روشنی

سے بھی تیز قدم دو پھر تیلے ریڈیر جتے ہیں جو اسے دنیا کے ہر گوشہ میں لے جاسکتے ہیں، سرد سے گرم علاقہ میں باراں سے بے آب خطہ میں، خوش منظر مرغزار سے مردہ ریگستان میں، وہ سب جگہ جاتا اور بچوں میں خوشیاں تقسیم کرتا ہے۔ پیتل کی چمکیلی گھنٹی بجا کر وہ خوشی سے نعرہ لگاتا ہے..... ہا ہا ہا! ہو ہو ہو ہو!

آج کرسمس ہے۔ برس بعد سانٹا کلاز اپنا خوشگوار فریضہ ادا کرنے کو تیار ہے۔ یہ اس کا دن ہے، سانٹا کلاز کے بغیر کرسمس نامکمل رہتا ہے۔

سانٹا کلاز پیتل کی گھنٹی بجاتا ہے، نرم باگ ہاتھ میں تھامتا ہے، اس کا اشارہ پاتے ہی ریڈیر ہوا ہو جاتے ہیں، تیز ہوا سے اس کی داڑھی گویا دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور سر سے بار بار کھسکتی سرخ پھند نے والی ٹوپی گویا سرخ دم والے پرندے کی مانند اڑ جائے گی۔ سردی، سردی، سردی اور سردی فضا اس کے جسم کی حرارت میں اضافہ کر رہی ہے۔ زمین پر ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو فضا میں اڑتا محسوس کر رہا ہے۔

جلد ہی سانٹا کلاز کی صدیوں پرانی جہاں دیدہ آنکھیں بھانپ لیتی ہیں کہ اس کرسمس میں سب کچھ ٹھیک نہیں، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ کسی چیز کی کمی کا احساس تھا مگر کیا موجود نہ تھا۔ اس کے بارے میں کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔ گاڑی کے ساتھ بھاگتے مناظر میں تبدیلی نہ ہو رہی تھی گویا اس کی گاڑی دائرہ میں بھاگ رہی ہو، شاید ایسا نہ تھا، بلکہ دائرہ بھاگ رہا تھا اور وہ اس میں ساکت تھا، عجیب نامانوس سے احساسات تھے۔ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا، عجیب فضا، عجیب ماحول، تب احساس ہوا کہ شاید وہ ایک دائرہ میں قید ہے جو کسی بڑے دائرہ کا حصہ ہے اور وہ دائرہ کسی نادیدہ دائرہ کا جزو۔

یسوع مسیح! کیا ہو رہا ہے یہ سب کیا ہے؟ کہیں میں کسی شیطانی چکر کا تو اسیر نہیں ہو گیا۔ کہیں پلید روحیں تو نہیں مجھے بہکا رہیں؟ آخر یہ سب کیوں ہے؟ یسوع رحم! اگر مجھ سے کوئی نادانی ہوئی ہے تو خداوند یسوع مسیح مجھے معاف کر دے!

سانٹا کلاز کی گاڑی رک جاتی ہے۔ ریڈیر کی گرم سانسوں سے ان کے منہ کے گرد بھاپ کے دائرے بن رہے تھے۔ عجیب ویران اور اداس کر دینے والا مقام تھا۔ سانٹا کلاز نے تحائف سے بھرا تھیلا اٹھایا، یہ تھیلا کبھی خالی نہ ہوتا تھا اور ہمیشہ دل کی مرادیں پوری کرتا، سامنے خانہ تارک تھا، سانٹا کلاز نے سوچا یہ کیسا نامراد مکان ہے جس میں کرسمس شمع روشن نہیں، جو بد بخت چولہے کی مانند ٹھنڈا ہے اور جس کی زمین مگر مچھ کی کھال کی طرح کھردری ہے۔ یقیناً یہاں کے ملول کمینوں کو روشنی، حرارت اور خوشیوں کی ضرورت ہو گی۔ سانٹا کلاز نے لمبے لمبے چند ڈگ ہی بھرے تھے کہ ٹھٹھک کر رک گیا، اندھیرے کی چادر میں لپٹے مکان کی گندی چوٹی سبزھیوں

پرایک چھوٹی بچی، ننھے ہاتھوں میں سر تھامے، اداسی اور دل گرفتگی کی تصویر بنی نظر آئی۔

سانتا کلاز نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ ہاہاہاہوہوہو!

وہ چمکتی ہے، لب کا نپتہ ہیں مگر خاموش رہتی ہے، تاہم بڑی بڑی اداس آنکھیں سوال کرتی ہیں۔

کون ہو تم؟

سانتا کلاز زور شور سے گھنٹی بجاتا ہے۔ ”مجھے نہیں جانتی؟“

وہ نفی میں سر ہلاتی ہے۔

کمال ہے۔۔۔۔۔۔ سانتا کلاز نے تعجب سے سوچا، عجب بچی ہے جو مجھے نہیں جانتی۔ سانتا کلاز کو؟ اور وہ بھی کرسمس کے

دون!

”میں سائنٹا کلاز ہوں۔“ وہ بالآخر اپنا تعارف کراتا ہے اگرچہ اسے یوں اپنا نام بتانا کچھ اچھا نہ لگا، بچی کی بڑی بڑی اداس

آ نکھیں ہاتھوں کی مانند گویا اس کا چہرہ مٹوتی ہیں۔

”سانتا کلاز؟“ وہ یوں دہراتی ہے گویا لفظ کا ذائقہ محسوس کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”سانتا کلوز“

”ہاں ہاں! سنا تا کلاز“ وہ گویا چمک کر اسے یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسے عدم دلچسپی سے گھور رہی ہے۔

ساتھ کلازا الجھن میں تھا۔ آج تک کسی بچے نے اسے پہچاننے سے انکار نہ کیا تھا، انکار کیسا! اسے دیکھ کر تو بچے خوشی سے کھل اٹھتے

اور من پسند تحائف کا تقاضا کرتے مگر یہ بچی تو اس کے نام تک سے واقف نہ تھی۔ اوہ مسیح! آج کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیسا کرمس ہے؟

”بیٹی!“ سناٹا کلاز نے اس کے قریب ہو کر گویا سمجھانے کے لہجہ میں کہا۔ ”میں سناٹا کلاز ہوں۔“

”بیٹی!“ سالتا کلاز نے اس کے قریب ہو کر گویا سمجھانے کے لہجہ میں کہا۔ ”میں سالتا کلاز ہوں۔“

”سائنس کا زہر؟“

”ہاں ہاں! میں کرمس کے موقع پر بچوں میں کھلونے، تحفے اور خوشیاں تقسیم کرتا ہوں۔“

”کھلونے، تحفے اور خوشیاں؟“ بیچی نے بے یقینی سے دہرایا۔

”ہاں ہاں“ وہ پر جوش لہجے میں تھیلے میں ہاتھ ڈال کر بولا۔ ”کھلونے“ تحفے خوشیاں۔۔۔۔۔ تمہیں کیا چاہیے؟“

”جو چاہتی ہوں مجھے ملے گا۔“ اس نے بے اعتباری سے پوچھا۔

”ضرور! ضرور“ سانٹا کلاز نے یقین دلایا۔

”مگر کیوں؟“

کسی بچے نے سانٹا کلاز سے یہ نہ پوچھا تھا۔ وہ بولا۔ ”اس لیے کہ میں سانٹا کلاز ہوں اور آج کرسمس ہے۔ محبت، امن اور خوشیوں کا دن۔“

وہ تذبذب سے کبھی اسے اور کبھی اس کے تھیلے کو دیکھتی ہے، سانٹا کلاز کی انگلیاں مناسب تحفہ کے لیے تھیلہ اٹھول رہی ہیں۔ بچی لمبی سانس لے کر کہتی ہے۔

”اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے میرا باپ لا دو۔“

تھیلے میں پھرتا سانٹا کلاز کا ہاتھ گویا پتھر میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا؟“

”مجھے میرا باپ چاہیے۔“

”بیٹی! میں سمجھا نہیں۔“

”تم کہتے ہو، اس تھیلے میں کھلونے، تحفے اور خوشیاں ہیں۔“

”ہاں“ سانٹا کلاز کا جوش ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔

”بس! تو پھر ٹھیک ہے، اس کرسمس کے موقع پر مجھے اپنا باپ چاہیے۔“

سانٹا کلاز نے اسے سمجھانا چاہا کہ باپ کھلونا نہیں جسے خوشیوں کے تھیلے میں سے نکال کر ہاتھ میں تھما دیا جائے۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور بچی کو گود میں بٹھالیا۔ معصوم چہرہ پر سنجیدہ اور سوال کرتی آنکھیں، الجھے بال اور جسم میں غربت کی بو، سانٹا کلاز نے پیار سے بچی کے الجھے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”بیٹی! کہاں ہے تمہارا باپ؟“

”مجھے نہیں پتہ۔“

”وہ کام پر گیا ہے؟“

”نہیں!“

”نہیں“

”کیا تمہارا خاوند چھوڑ گیا ہے؟“

”نہیں“

”تو پھر؟“

عورت کا جسم ایک لمحہ کو کسی کمان کی مانند تن جاتا ہے۔ وہ بولنے کو منہ کھولتی ہے۔ تب اچانک ہی وہ گویا مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ڈھل جاتی ہے وہ سیڑھیوں پر بیٹھ جاتی ہے اور پھر اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگتی ہے۔ سانٹا کلاز آج تک ایسی صورت حال سے دو چار نہ ہوا تھا۔ اسے تو کمرس کے دن ہمیشہ قہقہے لگاتے بچے اور سرور الدین ہی ملے تھے مگر آج یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا ہے مگر نہیں جانتا کہ ایسے مواقع پر کیا کیا جاتا ہے یہ اس کی تربیت میں شامل نہ تھا۔ وہ خاموش رہا، عورت روتی رہی۔ سانٹا کلاز کی گود میں بیٹھی بچی بھی پریشان نظروں سے اسے دیکھتی رہی مگر خاموش رہی بارے وہ خاموش ہوئی۔

”معذرت“ وہ بولی۔ ”مجھے یوں رونا نہ چاہیے تھا۔“

سانٹا کلاز نے آنسوؤں سے دھلا چہرہ دیکھا سفید اور لال رنگ دھل جانے کے بعد اندر سے کیسا سچا اور کھرا چہرہ نکل آیا تھا۔ گالوں پر آنسوؤں کی نمکین راہ چمک رہی تھی۔

”بات یہ ہے۔“ عورت نے انک انک کر بولنا شروع کیا۔

”بچی کا کوئی باپ نہیں۔“

”کیوں؟“

”کہ میرا کوئی خاوند نہیں۔“

”کیوں؟“

وہ چڑ کر بولی۔ ”سانٹا کلاز ہوتے ہوئے تم اتنے احمق کیوں ہو؟“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“

”نہیں“ وہ زور دے کر بولی۔ ”وہ بات نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔“

”تو پھر؟“



اس نے اپا ج سے پوچھا۔ سانتا کلاز کو بے بسی میں چھپے چہرہ کے نقوش شناسا سے لگے، شاید بچپن میں اسے کھلونے اور تحفے دے چکا تھا۔ تو کیا سانتا کلاز کے ہاتھوں کھلونے اور تحفے حاصل کرنے والے بچوں کا یہ انجام ہوتا ہے؟

”میرا خیال ہے ہم پہلے بھی مل چکے ہیں؟“ سانتا کلاز نے قدرے جھجک کر پوچھا۔

”ہاں“ وہ بولا۔ ”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ پھر یک لخت بولا۔ ”مجھے یاد آ گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ یقیناً ہم مل چکے ہیں۔“

”اچھا؟“ سانتا کلاز خوش ہو کر بولا۔

”بالکل یاد آ گیا، تم نے بچپن میں مجھے تحفہ دیا تھا۔“

سانتا کلاز خوش تھا کہ اس کا اندازہ غلط نہ نکلا۔ ”کیا تحفہ تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہیں نہیں یاد؟“

”نہیں تو“ سانتا کلاز نے وضاحت کی۔ ”اتنے تحفے تقسیم کرتا ہوں بھلا کیسے یاد رکھ سکتا ہوں کہ کسے کیا کیا دیا۔“

”اے کاش تم یاد رکھ سکتے۔“ وہ آ زردگی سے بولا۔

”کیوں کیوں ہوا کیا؟“

اپا ج نے بتایا۔ ”تم نے کرسمس کے موقع پر مجھے شاعری کی کتاب تحفہ میں دی تھی۔“

”مگر یہ تو خوبصورت تحفہ ہے۔“

”یقیناً“

”پھر تلخ کیوں ہو؟“

”اس لیے کہ شاعری کی بجائے کوئی اور تحفہ۔۔۔۔۔۔۔۔ مثلاً کھلونے، مٹھائی وغیرہ دے دیتے تو آج میرا یہ حال نہ ہوتا۔“

”شاعری کا اپا ج ہونے سے کیا تعلق؟“

”واقعی کوئی تعلق نہیں۔“ وہ تلخی سے ہنسا۔ ”مگر میری مثال میں بن گیا۔“

”وہ کیسے؟“

”شاعری کی کتاب نے میرے دل پر گہرے اثرات چھوڑے اور میں ہر وقت شعر کی دنیا میں رہنے لگا۔ تصور پرست اور تخیل مست۔۔۔۔۔۔ یوں میں شاعر بن گیا، حسن اور محبت کے گیت گانے والا انسان کو انسان سمجھ کر سب سے محبت کرنے والا۔“

”مگر یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ خرابی کیسے ہوئی؟“

”خرابی یوں ہوئی کہ میں ظالموں کی بستی کا شاعر تھا۔ ظلم پر جہنی معاشرہ میں انسان کی عظمت، مساوات اور حقوق کا شاعر تھا۔ میں زندگی میں حسن خوشی، نغمہ اور الفت کا شاعر تھا۔ مگر یہ باتیں بستی کے ظالموں کو خوش نہ آئیں، جیسے جیسے پھولوں کی مہک کی مانند میرے اشعار کی شہرت پھیلتی گئی ویسے ویسے ہی بستی کے ظالم میرے خلاف ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ایک دن مجھے بے دین اور باغی قرار دے کر بستی کا سکھ چین غارت کرنے کا جرم عائد کر کے مجھے اس حال میں پہنچا کر بستی سے باہر نکال دیا گیا۔“

سانتا کلاز کا جھکا سراو پر نہ اٹھ رہا تھا۔

”اب میں اس راستے پر پڑا ہوں، راہ کے پتھر کی مانند۔“

”اور تمہاری شاعری؟“

”مجھے سب سے بڑا دکھ یہی ہے کہ میں اب شاعری کے قابل نہیں رہا۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“

”ہاں، تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو؟“

”ہاں، یقینی طور پر۔“

”اگر تم بھی میرے ہم خیال ہو تو پھر اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالو اور میری گمشدہ شاعری مجھے واپس لوٹا دو، میرے مردہ تصورات میں جان ڈال دو، میں پہلے کی مانند لفظوں کا نبض شناس بن جاؤں۔“

سانتا کلاز سر جھکائے بیٹھا رہا۔

شاعر بولے جارہا تھا۔ ”پہلے میں تخیل کے پر لگا کر ان دیکھی فضاؤں میں پرواز کرتا تھا مگر اب یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ موم کے نقلی پر تھے، نہ بلندی تک لے جاسکتے ہیں نہ تمازت برداشت کر سکتے ہیں۔“

خفت سے سانتا کلاز کا چہرہ سرخ ہو گیا اس کے پاس تو معذرت کے لیے الفاظ بھی نہ تھے اور پھر وہ کن لفظوں میں شاعر سے معذرت کرتا؟ وہ خاموشی سے بوجھل قدموں سے اپنا ج شاعر کے پاس سے اٹھ گیا۔ اب اسے خوش و خرم لوگوں کی تلاش تھی تاکہ تحائف سے بھرا تھیلا خالی کر کے کرمس کے فرض سے سبکدوش ہو سکے۔

سانتا کلاز ایک پر رونق بستی سے گزر رہا تھا کہ اسے بھیڑ نظر آئی۔ سانتا کلاز بھی کھڑا ہوا، نورانی چہرہ اور مقدس داڑھی والا مقرر پر

جوش اسلوب میں نیکی، عبادت، شرافت، اخلاقی قدروں، مذہب اور خدا کے حقوق کی تلقین کر رہا تھا۔ وہ بار بار اس امر پر زور دے رہا تھا۔ یہ زندگی فانی ہے، یہ دنیا نظر کا دھوکا ہے، نیکی کی صورت میں دائمی زندگی کے سفر کے لیے زاد راہ جمع کرنا چاہیے۔ وہ بڑے موثر لہجہ میں بڑی اچھی نصیحتیں کر رہا تھا، مجمع سے متاثر معلوم ہو رہا تھا کہ سب کی گردنیں اس کے الفاظ سے اتفاق میں ہل رہی تھیں۔ اس نے دعائے خیر پر وعظ ختم کیا۔ سب نے حسب استطاعت اسے کچھ نہ کچھ دیا اور یہ بھی بہت کچھ تھا۔ لوگ رخصت ہو گئے۔ واعظ خوشی خوشی پیسے گن رہا تھا کہ آگے بڑھ کر سنانا کلاز نے اسے سلام کیا۔

نورانی چہرہ اور مقدس دائرہی والے مرد نیکو کار نے اسے سر سے پاؤں تک تمسخرانہ انداز میں دیکھا۔

”کون ہو تم؟“ وہ روکھے لہجہ میں بولا۔

سامتا کلاز نے اپنا تعارف کرایا۔

”واقعی؟ کیا تم واقعی سائنساکلاز ہو؟“

”تمہیں شک ہے کیا؟“

”در اصل میں تو سانپا کا از کو بچوں کا ڈھکوسلہ سمجھتا رہا ہوں۔“

”مگر تم دیکھ رہے ہو کہ میں حقیقت ہوں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“

سامتا کلاز نے کہا۔ ”تم نیک بندے ہو میں تمہارے وعظ سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔“

وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”واقعی؟“

”تمہیں پتہ ہونا چاہیے۔ سنا کلاز جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔“ وہ ایک لمحہ کو جھجکا، پھر بولا۔ ”پھر میں بھی سنانا کلاز سے جھوٹ نہ بولوں گا۔“

”کیا بات ہے؟“ سائنٹا کلاز نے ہمدردی سے پوچھا۔

”دراصل-----دراصل مجھے خود اپنے کہے پر اعتبار نہیں۔“

”کیا مطلب ----- کیا تم مذہبی نہیں ہو؟“

”یوں سمجھو کہ میں بے مذہب نہیں ہوں۔“

صرف بچوں میں کھلونے، مٹھائیاں اور تحفے ہی تقسیم کر سکتا تھا۔

”خدا تمہاری مدد کرے۔“ اس نے بمشکل کہا اور چل دیا۔

”ٹھہرو، دو قدم چلا تھا کہ اس نے آواز دی۔ سانٹا کلاز نے مڑ کر دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”سانٹا کلاز“ وہ بولا۔ ”تم اگر واقعی کرسمس کے تحفے تقسیم کر رہے ہو تو میری طرح ایک اور شخص بھی تحفہ کا طلبگار ہے۔“

”وہ کون ہے؟“

”میرا دوست۔ ہم دونوں نے اکٹھے عملی زندگی شروع کی تھی۔ میں مذہبی بن گیا اور وہ مجرم“

”تو؟“

”تم اس سے ملو اگر تم اسے راہ راست پر لا سکتے تو سمجھ لینا کہ یہ کرسمس ضائع نہ گیا۔“

سانٹا کلاز نے مجرم کو اور مجرم نے سانٹا کلاز کو تلاشی لینے والی نظروں سے دیکھا۔ اس کے ہونٹ کوئی طنزیہ بات کہنے کا استہزاء یہ انداز میں کھلے مگر انہیں سختی سے بند کر لیا۔ لمبو ترے چہرہ پر لکیر کی مانند سانٹا کلاز تذبذب میں تھا۔ وہ اب تک بچوں سے ملتا آیا تھا جو اسے دیکھ کر خوشی سے قہقہے لگاتے۔ وہ انہیں تحفے دیتا، بہتر مستقبل کی دعائیں دیتا اور اپنی راہ لگتا مگر یہ عجیب کرسمس تھا کہ ایسے ایسے لوگوں سے ملنا پڑ رہا تھا جن کے لیے اس کے سدا بہار تھیلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ سانٹا کلاز نے نرمی سے پوچھا۔ ”میں تمہیں تحفہ میں کیا دے سکتا ہوں؟“

”کیا تم وہی ہو جو نظر آ رہے ہو؟“

”تمہیں شک ہے کیا؟“

”در اصل میں تو سانٹا کلاز کو بچوں کو بہلانے والی چیز سمجھتا رہا ہوں۔“

”تم بھی تو خداوند یسوع مسیح کی نظروں میں بچہ ہی ہو۔“

وہ یہ سن کر لرز گیا اور کانپتی آواز میں بولا۔ ”ہاں ہاں بے شک“ سانٹا کلاز سکون سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ عجب کرب ناک لہجہ میں بولا۔ ”میں بچہ تھا، بہت برس پہلے۔ شاید صدیوں پہلے، جب میں معصومیت سے قہقہہ لگا سکتا تھا اور

بھولپن سے سوال کر سکتا تھا، جب میں نادانیاں کر سکتا تھا مگر اب نہیں، اب تو میں سخت دل مجرم بن چکا ہوں۔“

سانٹا کلاز صبر سے ستار ہا، وہ بتا رہا تھا۔

”کون سا جرم ہے جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔“

”جب یہ احساس ہے تو پھر تائب ہو جاؤ۔“

”میں تو تائب ہونا چاہتا ہوں مگر ہو نہیں سکتا۔“

”کیوں؟ خدا کے گھر کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں۔“

”میں گیا تھا اعتراف گناہ کے لیے۔ مقدس مریم کے مجسمے کے سامنے مومی شمع بھی روشن کی تھی مگر بات نہ بنی۔“

”کیوں؟“

”جرائم نے میرا ضمیر مردہ کر دیا ہے تم بنجر زمین میں پھول نہیں کھلا سکتے۔“ اس نے سانتا کلاز کو اداس آنکھوں سے دیکھا۔ ”یہی میرا حال ہے میں توبہ کرتا ہوں مگر مجرم آنکھوں سے گناہوں کو دھو دینے والی پشیمانی کے آنسو نہیں بہتے۔“ اس نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا چاہتا ہوں مگر یہ مجرم ہاتھ جیسے کسی اور کے مجھ سے بھی بڑے مجرم کے ہاتھوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”سانتا کلاز! کیا تم میرا دکھ سمجھ سکتے ہو؟ میں تائب ہونا چاہتا ہوں مگر توبہ کر نہیں پاتا۔“

سانتا کلاز نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، میں اسے کیا دے سکتا ہوں سوائے دعا کے۔ وہ بڑبڑایا۔ ”توبہ قبول تو بعد میں ہوتی ہے پہلے توبہ تو ہو جائے۔“

سانتا کلاز نے کرمس کی جس صبح کا آغاز بڑے جوش و خوشی اور تیاریوں سے کیا تھا اب شام کے پھلتے سایوں کی مانند اس کے دل پر بھی اندوہ کے سائے پھیلا رہی تھی۔ اس نے اپنا دل حرام کی مٹھی میں پایا، سانتا کلاز نے آسمان کو دیکھا اور پھر پسینہ پر صلیب کا نشان بنایا۔ یہ کیسی دنیا ہے اور یہ کیسے لوگ ہیں اور یہ کیسا کرمس ہے جس میں کھلونوں، مٹھائیوں اور تحفوں سے بھرا تھیلا خالی رہ گیا۔ اس کا اداس غم سے معمور تھا۔

”اے“ اسے خشونت بھرے لہجہ میں پکارا گیا۔

سانتا کلاز نے مڑ کر دیکھا۔ قانون کے محافظ کھڑے تھے۔ ”اے کون ہو تم؟“

”میں؟“ سانتا کلاز نے حیرت سے سوچا بھلا ایسا کون ہے جو مجھے بھی نہ جانے۔

”ہاں! ہاں تم! کون ہو اور ادھر کیا کرتے پھر رہے ہو؟“

”بھائی میں سانتا کلاز ہوں۔“

وہ قہقہہ لگا رہے تھے۔ ایک بولا۔ ”سانتا کلاز سالے تم تو مجھے بہرو پئے لگتے ہو۔“

”بہرو پیا نہیں تو پھر مسخرا۔“

”اور یہ تمہارے تھیلے میں کیا ہے؟“ ایک نے پوچھا۔

سانتا کلاز کا جواب سننے سے پہلے دوسرا بولا۔

”یقیناً چوری کا مال ہوگا۔“

”دکھاؤ تو“

”بھائیو! اس میں بچوں کے لیے کھلونے، مٹھائیاں اور تحفے ہیں۔“

ایک نے اس کی نقل اتاری۔ ”بچوں کے لیے کھلونے، مٹھائیاں اور تحفے ہیں۔ حرامی چور کہیں کا۔“

اس کے ساتھی نے سانتا کلاز کو گردن سے پکڑ کر جھینکا دیا۔

”چلو انصاف گھر لے چلو اسے۔“

”مگر کیوں؟“ اس نے احتجاج کیا۔ ”میں سانتا کلاز ہوں اور سانتا کلاز انصاف گھر نہیں جاتا۔“

”انصاف گھر نہیں جاتا تو کیا چپکے جائے گا؟“

سب نے قہقہہ لگائے۔

”تلاشی تو لو اس سالے سانتا کلاز کی۔“ ایک نے تمسخر سے کہا۔

”ہم بھی دیکھیں کہ اس نے بچوں کے لیے کون کون سے کھلونے، مٹھائیاں اور تحفے چرار کھے ہیں۔“

تلاشی پر سانتا کلاز کے تھیلے میں سے کچھ بھی نہ نکلا۔ تب اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور لے چلے اسے انصاف

گھر!



موہنی

وہ کئی دنوں سے بنوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ درختوں کے تنوں کو زندہ انسانی جسم کی مانند چھو کر پرکھتا مگر وہ دھڑکن محسوس نہ کرتا جو درخت کو محض درخت سے بلند کر کے کسی اور کا مظہر بنا دیتی ہے۔ ان کی کھروری چھال مگر مجھ کی کھال جیسی سخت اور بدرنگ اور کریہہ محسوس ہوتی۔ تب ایک برق گزیدہ سیاہ اور کھوکھلے تنے کے سامنے رک کر دیر تک عالم محویت میں اسے آنکھارتا رہا۔ پھولوں کا گلہستہ رکھ کر اس کی بد صورتی سندر تا میں تبدیل کی جاسکتی ہے مگر اس تن جلے کے لئے اس سے زیادہ اور کچھ کرنا ممکن نہیں۔ جس نایاب کی ضرورت تھی جنگل اس سے خالی تھا۔

وہ دیوی کی مورتی بنانے کے لئے اسے زندہ شجر کا متلاشی تھا جو دیوی کی سندر تا سے جل کر رکھ نہ ہو جائے اور اس کی شکتی کا بوجھ سنبھال سکے۔

مورتی کار نے پسند دیکھا تھا۔

کھلی کھلی فضا، روشنی ہی روشنی، انجانے سازوں پر ایسی دھنیں کہ سن کر من پنچھی جھوم کر باولا ہو جائے۔ تب اس نے اس کا سراپا دیکھا۔ وہ جس کا نام زبان پر لانے سے انگارہ ہو جائے اور اس کے شہد کی شکتی کا بوجھ ہر وہ نہ اٹھا سکے۔ آنکھیں دیکھنے کی تاب نہ لا کر کنکروں میں تبدیل ہو جائیں۔ وہ کچھ بھی نہ دیکھ پایا۔ بس ایک جھلک تھی، بلکہ جھلک کی جھلک۔ شریر میں انجانی کپکپی، وہ آنکھ کھلنے کے بعد سرشار رہا، مگر نری سرشاری کا کیا فائدہ؟ وہ تو خواب اور سرشاری کو زندہ روپ دینا چاہتا تھا۔ آخر دنیا بھی تو دیکھے، جو اس نے دیکھا، سمجھا، محسوس کیا۔

ناامید ہو کر بنوں کے حصار سے باہر آ گیا۔

کھوج کا سفر جاری رہا، جستجو کا شعلہ مدھم نہ ہوا، تلاش کی منزلوں میں کوشش کے سنگ میل بنتے گئے۔ اندر کی آگ نے اسے پارہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں، بے کلی کے عالم میں اس نے میرا کی کسک کو دل میں محسوس کیا وہ کسک جس نے اسے پریم دیوانی بنا دیا تھا۔ گھونگھٹ کے پٹ کھول تو ہے پیالیں گے۔

مورتی کار کے لئے دنیا جیسے کسی ان جانے گھونگھٹ میں چھپ کر رہ گئی، جنگل، میدان، کھیت، کھلیان سب کے رنگ اور خوشبو

کھنگال ڈالی مگر تلاش کی جوالا بھڑکتی ہی رہی نہ برکھانہ بادل نہ پانی نہ شبنم۔
مورتی کا رگیون سے غافل ہوا تو رگیون سا تھی روٹھ گئی۔

وہ پہاڑوں کی بستی میں وارد ہوا۔ آگ میں جلے دھوئیں میں جھلے دھوپ میں چٹخے پہاڑ جن کے پتھروں میں آندھیوں نے
سوراخ کر دیئے تھے یوں کہ ان میں سے گزرتی شوکتی ہوا پاگل سی ہو جاتی۔ پہاڑیاں نیلے چٹانیں پتھر کنکر گرد سیاہ رنگ بدرنگ بد
ہیت دہشت ناک منظر دہشت ناک ہوا حتیٰ کہ آسمان بھی نیلے کی بجائے دھواں دھواں سادکھائی دیتا۔
تلاش کہاں لے آئی؟ جستجو کا یہ انجام؟

ننگے سیاہ پتھروں سے آنچ کے مرغولے اٹھ رہے تھے تپش کے لمبے لمبے بازو گویا ساتھ لپٹا رہے ہوں۔ جوتی کے باوجود ننگے
پاؤں ہونے کی حدت کا احساس۔ پسینہ نے اس کے پاؤں کے گرد نمی کا دائرہ بنا دیا تھا۔ اس نے بھاگ جانا چاہا مگر نہیں یہ کھوج کے
تقاضوں کے منافی تھا۔ جستجو کی ریت میں فرار ممکن نہیں تھا۔ سو بھول جیسی فضا میں کھڑا سلگتا رہا۔ نظر کی چیز یا پھڑ پھڑاتی پھڑ پھڑاتی ادھر
ادھر جاتی مگر عافیت کا گھونسلہ نہ پا کر واپس آ جاتی۔ سبز رنگ کی ٹھنڈک پانی کی ٹٹکی اور نیلے رنگ کی تراوٹ سے نا آشنا جلتی دھرتی نے
اس کے قدم تھام لئے تھے۔ وہ حیرت زدہ کھڑا تھا۔ وہ اور اس کی آنکھیں اس کے حواس اس کے اعصاب اس کا جسم اس کی روح
سب مل کر ویرانی کو جذب کر رہے تھے۔

”آہ“ مورتی کا ربے بسی سے کراہا۔

پاؤں کے گرد نمی کا دائرہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

اور تب عین اس وقت جبکہ حواس اور ہوش اور نظر ساتھ چھوڑنے کو تھے تو دور سب سے بلند سب سے سیاہ اور سب سے مشکل پہاڑ
کی چوٹی پر اسے دودھیا چٹان دکتی نظر آئی۔

”اوہ!“ مورتی کا عالم حیرت میں تھا۔

”شاید“ مورتی کا عالم تذبذب میں تھا۔

”یقیناً“ مورتی کا عالم اعتماد میں تھا۔

اب پہاڑ خوفزدہ نہ کر سکتے تھے۔ ان کی سیاہی وحشت خیز نہ تھی اور تپش کے لرزاں بازوؤں میں پھیلے جال میں خود کو بے بس مسمیٰ کی
مانند محسوس کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

دونوں بازو پھیلائے تو انہیں افق تا افق پھیلتے پایا۔ گردن اونچی کی تو آسمان سے جا لگی۔ اب تک وہ خود کو جسم عظیم مقناطیس کے ساتھ آہنی ذرہ کی مانند چپکا محسوس کر رہا تھا اب اس کی طلسمی کشش ختم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پسینے کے دائرہ سے باہر نکل آیا۔ ایک قدم ایک اور قدم ایک اور ایک اور ایک اور۔

انگارہ بنے سوراخوں سے سیاہ ناگ دوشاخہ زبانیں لہرا لہرا کر شوکتے رہ گئے۔ زہر کے نشہ میں بدمست پچھو بزنگوں کی زہر بھی مالا اٹھائے اس کے ساتھ ساتھ چلتے مگر آگ بنے پتھروں کی تاب نہ لا کر واپس مڑ جاتے۔ گرم درزوں میں سے ہزار پانکتے مگر تپش سے جل کر بل کھا جاتے۔

مورتی کا ربڑ ہٹا گیا۔

لڑکھڑا کر گرا تو سنبھلنے کے لئے جس ڈالی کا سہارا لیا وہ کوڑیا لاکھی ترل ترل کی آواز سنی تو وہ چشمہ جان کر لپکا مگر وہ مجروح چمکا ڈر کے خون کے قطرے تھے۔ تھوڑا بڑھا تو ایک جگہ سیاہ چیونٹیوں کی بحسم قطار دور تک پھیلتی دیکھی۔

ایک قدم اور ایک اور قدم۔

سیاہ چیتے نے سیاہ آنکھیں جھپکا کر جست لگانے کو جسم سیدھا کیا مگر پھر جیسے گرمی کے تیر سے زخمی ہو کر ڈھ گیا۔

ایک قدم اور ایک اور قدم اور پھر آخری قدم

اور تب اچانک اس نے پہاڑوں کو سبز جھولے کی گود میں پایا۔ ہوا جھولیاں بھر بھر کر مہک انڈیل رہی تھی۔ جھرنا پھوٹ بہا، آبشار نے انگڑائی لی، ندی اٹھلائی اور جھیل کا آئینہ ٹھٹھکا۔ پرندے خیر مقدمی گیت گارہے تھے۔

دودھیا چٹان کے گرد بازو لپٹے تو اسے محبوبہ کی مانند نرم گرم اور دھڑکن سے معمور پایا۔ اسے سینہ سے لگائے نشیب میں اترتے وقت اس میں گرم خود پردگی محسوس کی۔ سگی وزن پکھڑیوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔

موتی کار نے باہر کی دنیا پر گھر کا دروازہ بند کیا تو اس کے لئے گویا وقت تھم گیا، باہر کتنے سورج اگے، کتنے چاند بجھے، کتنے ستاروں کی فصل کٹی، کتنی شاخوں نے پھولوں کو جھولے دیئے۔ کتنے پھول کاغذ بنے۔ اسے خبر نہ ہوئی۔

اسے پہلے بھی اپنے جیون اور جیون ساتھی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اب تو وہ بالکل ہی اپنے مدار کا اسیر ہو کر رہ گیا۔

بچہ آ کر کھانا رکھ جاتا اور پھر دہلیز سے خالی برتن اٹھا کر لے جاتا۔

خواب مورتی کا رکے ہاتھ میں اتر آیا تھا، تمنا شکتی پیدا کر رہی تھی، دل اوزاروں میں دھڑک رہا تھا اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب دل

دھڑکن بھولا۔ خواب پتھر میں منتقل ہو چکا تھا۔

جس کا نام نہ لیا جاسکتا تھا، جس کی ادھوری جھلک نے خود فراموش بنا دیا تھا، جس کی طلب کی خلجان نے اسے جیون اور جیون ساتھی سے لا تعلق بنا دیا تھا وہ اب سنگی روپ میں مجسم تھی۔ چہرہ پر ٹھنکی شرم کا ایسا تاثر گویا غسل میں غیر کو اپنی اور گھورتے پایا ہو، شرم کی سرخی سنگی رخساروں پر پھیلتی محسوس کی جاسکتی تھی، بالائی لب کا خم، نچلے ہونٹ کا بھر بھرا پن، ان پر خجل مسکراہٹ، ترجیحی نظروں کا انداز دلربائی، کمر میں کنول کے ڈنٹھل جیسی خفیف لرزش کی خفیف سی سنگی سلوٹ، ایک ہاتھ سیدھا دوسرا گیت کے سر کی مانند اٹھتا ہوا یوں کہ پھیلی انگلیاں اڑتی تان کو پکڑتی محسوس ہوں۔ نرت میں دیوداسی کے انگ کا لوچ سنگی جسم میں محسوس کیا جاسکتا تھا گویا شاخ گل شبنم جھٹکنے کو ہو۔

مورتی کا رشرابی جیسی مخمور آنکھوں سے مورتی کو دیکھ لیا۔

بستی کے لوگ من موہنی مورت کے درشن کو جمع ہو گئے، سبھی تعریف کر رہے تھے مگر اس نے تعریف کی بجھٹ قبول نہ کی کہ تعریف کے پھولوں میں کانٹوں کی چھین بھی محسوس کر سکتا تھا۔

پجاری نے مندر میں رکھنے کی پیشکش کی مگر یہ نہ مانا۔

سب کے جانے کے بعد جیون ساتھی آئی۔ نک مورتی کو دیکھا۔ چہرہ پہلے سرخ، پھر زرد اور پھر سیاہ ہو گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مورتی کو گھورتی رہ گئی۔ وہ اسے متوقع نظروں سے نکتار ہا مگر اس کے رندھے حلق سے صرف زہر میں بجھا ایک لفظ ادا ہوا۔ ”سوت“

مورتی کا رنے اسے سمجھانا چاہا، خواب کے نشہ اور کھوج کی آنچ کا احساس کرائے، مگر یہ بھی جانتا تھا کہ چولہا چوکا کرنے والی یہ نادان کچھ نہ سمجھ پائے گی۔ ان دونوں کے درمیان بچہ کھڑا دونوں کے منہ باری باری تک رہا تھا۔ اسے پریشان دیکھ کر گود میں لینا چاہا تو وہ ماں کے آنچل کی پناہ میں آ گیا۔

جیون ساتھی نے ایک مرتبہ پھر کڑوی نظروں سے مورتی کو دیکھا، آنکھوں سے قتل ممکن ہوتا تو یہ سوت ہلاک ہو چکی تھی۔ جب وہ جانے کو مڑی تو اسے توقع تھی کہ وہ آنچل چھو کر روک لے گا۔ میری خاطر نہ سہی بچہ کی خاطر۔ ایک لمحہ کو دہلیز پر تھم گئی، جیسے سانس لینے کو رک سی گئی ہو، مگر وہ خاموش سر جھکائے کھڑا رہا۔ وہ دہلیز الا نگ گئی، بچہ نے گردن موڑ کر باپ کو دیکھا مگر پھر ماں کے پیچھے ہولیا، اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر اس عورت کی پشت کو دیکھا جواب اس کے جیون سے نکلی جا رہی تھی۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا، ہاتھ اٹھانا چاہا مگر ہاتھ گویا پتھر میں تبدیل ہو گیا۔ وہ ایک وقت میں دوکانیں ہو سکتا تھا۔ یہ اس کے آدرش کے خلاف تھا۔ جب مردہ پتھروں سے زندہ

روپ برآمد کرنے والے ہاتھوں کی ریکھا میں تنہائی مقدر ہے تو پھر ایک کا ساتھ چھٹنے کا کیا غم۔ اس نے مورقی کی ترچھی آنکھوں میں جھانکا تو خمیدہ ہونٹوں پر پھیلی مسکان میں شانتی ہی شانتی نظر آئی۔

کامیابی کا جو اطمینان ہونا چاہتا تھا مورقی کا رخود کو اس سے محروم پاتا تھا اگرچہ ساری بستی مورقی کے گن گار ہی تھی مگر وہ مطمئن نہ تھا۔ کام ختم ہو جانے کی خوشی تو تھی مگر گہرا گمبھیر سا گر جیسا سکون نہ تھا۔

وہ ٹکٹ باندھے مورقی کو دیکھتا رہتا جو زندہ ہوتے ہوئے بھی زندہ نہ تھی جبکہ وہ اس کی رگوں میں اگلے خون کی سنسناہٹ سننا چاہتا تھا۔ ترچھی نظروں کی پتلی میں ستارے دکنے چاہیں انگ کی خمیدگی میں زندگی کا لہرایا بھی تو ہونا چاہیے سر کی مانند اٹھے ہاتھ کو لذت کا دائرہ بھی تو مکمل کرنا چاہیے خجالت سے پر مسکراہٹ ہنسی کے فوارہ میں کب تبدیل ہوگی۔

خواب حقیقت بن چکا تھا مگر یہ زندہ حقیقت تو نہ تھی۔

مورقی کا رگھر آیا۔ بچہ خوشی سے ٹانگوں سے لپٹ گیا مگر گھر والی نے گر مجبوشی کا اظہار نہ کیا۔ پتھر جیسا چہرہ لئے وہ اسے نیم کی نبولی جیسی کڑوی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سر جھکا کر کھاٹ پر بیٹھ گیا وہ سامنے کھڑی ننگے پاؤں کے انگوٹھے سے کچے فرش پر دائرہ بناتی رہی۔ اگر یہ پچھلے کرتوت کی شام اگلے آئے تو میں اسے شاکر دوں گی یہ دل کا برا نہیں بس باؤلا سا ہے۔ اس نے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر خود کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر اس نے شامہ مانگی۔ اس نے جھک کر گلا صاف کیا پھر بولا۔ ”مجھے تم سے کچھ لینا ہے۔“

انگوٹھے کی گردش تھم گئی وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے منہ اٹھایا دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں مگر دونوں نے گھبرا کر نظریں پلٹ دیں۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں سے خائف تھے۔ وہ دوبارہ یوں بولا گویا گلاس کا پانی انڈیل دیا ہو۔

”مجھے تم سے کچھ مانگنا ہے۔“

”ہوں؟“

”تمہاری آنکھوں کا کاجل تمہارے ہونٹوں کی لالی تمہارے انگ کی...“

”نہیں!“ وہ چیخی

”دیکھو“ وہ سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”ان سب کے بغیر وہ محض ایک مورقی ہے پتھر کی بے جان مورقی۔“ وہ اس کی جانب نہ دیکھ رہی تھی۔ ”میں نے اس پر بہت محنت خرچ کی ہے اپنے ہنرک تمام شکلی اسے سوئپ دی ہے ایک آدرش ناری بنا کر میں اسے...“

مورقی کا رنے بولنا شروع کیا تو بولتا ہی گیا۔ ”میں نے خواب میں دیوی دیکھی۔ وہ روپ جس کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ میں پتھر سے مورقی

نہیں بنا رہا تھا بلکہ خواب کو تعبیر دے رہا تھا۔ پر چھائی کو محسوس کر رہا تھا اور کلپنا کو انگ دے رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ کو سانس لینے کے لئے رکا پھر گویا ہوا۔ ”مگر مکمل ہو جانے کے باوجود بھی یہ مکمل نہیں تب میں نے سوچا کہ کاجل کے بغیر اس کی پتھر ملی آنکھوں میں زندگی کی چمک نہ پیدا ہوگی لالی کے بغیر مسکراہٹ منجمد رہے گی پیار کے بغیر اس کا شیر گرمی کی دھڑکن سے محروم رہے گا۔ سمجھی تم!“

وہ اسے پتھر ملی نظروں سے دیکھ رہی تھی وہ غصہ کے بغیر رسان سے بولی۔ ”پہلے اس نے مجھ سے تمہیں چھینا اور اب چھنال مجھ سے اپنا پن مانگ رہی ہے۔ میری سوت، میرا کاجل لگائے گی تو اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں گی، میری لالی اس کے ہونٹوں پر کولہ بن کر دھکے گی، میرے بال اس کے سر پر ناگوں میں تبدیل ہو جائیں گے جو کچھ تم مانگ رہے ہو یہ میں نہیں دیکھ سکتی۔ کسی اندھے کے لئے میں آنکھیں دان کر سکتی تھی کسی بوڑھی کو یہ تن دے سکتی تھی مگر سوت کے لئے؟ ہرگز نہیں، سمجھے؟“

وہ اس کے سامنے جھکی، چرنوں کو پر نام کیا اور جوتے اٹھا کر باہر چوکھٹ پر رکھ دیئے۔

وہ خاموشی سے گھر سے نکل گیا۔ بے مقصد بستی کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا رہا، پھر باہر کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر اور پھر پیاس بجھانے پن گھٹ پر۔ چنچل ناریاں گھڑے بھر رہی تھیں، ہنس رہی تھیں، چہلیں ہو رہی تھیں، ایک دوسرے پر فقروں کے چھینٹے اڑائے جا رہے تھے۔ اسے دیکھ لکھ بھر کو ٹھٹھکیں پھر سروں پر چائیاں رکھ کر لہراتی ہوئی چل دیں۔ سوائے ایک کے، چولی میں پھانسی سخت چھاتیوں اور نرم کولہوں والی مین منکاتی ناز و پانی پلانے کو اس کی جانب جھکی تو پانی کی سرد دھار کو جوالا میں تبدیلی ہوتا محسوس کیا، لب خاموش تھے مگر تھکے مین بول رہے تھے، وہ مورتی دیکھ چکی تھی اور اب مورتی کا سامنے تھا۔ وہ آنکھوں کی پیاس محسوس کر سکتی تھی، یہ ضرور کچھ کہے گا، کچھ طلب کرے گا، سو منتظر رہی۔ مگر جو مانگ رہا تھا وہ دینا کیسے ممکن تھا، بال مانگ، بندیا، جھانجرا، عورت پن دان میں نہیں ملا کرتا۔ یہ مورتی اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتا؟

وہ بڑی رکھائی سے بولی۔ ”اگلے چاند میرا لگن ہے۔“

وہ سر جھکائے چل دیا۔

آخری امید ویشیا تھی۔ مورتی کا رستی سے باہر جسم فروش عورتوں کے لئے مخصوص ممنوعہ علاقہ میں گیا اور سب سے خوبصورت، کم سن اور مقبول ویشیا کے پاؤں میں تمام پونجی ڈھیر کر دی۔

”یہ کیا؟“ وہ حیرت سے اس مورتی کا رکو دیکھ رہی تھی جس کی مورتی کا چر چایہاں تک بھی پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنی ضرورت بیان کر رہا

تھا۔ ”جو کچھ بھی میرے پاس تھا وہ سب کچھ لے آیا ہوں، یہ لے لو اور اس مورتی کو زندہ کرنے کے لئے اپنا پن مجھے بخش دو۔“

وہ اسے خاموشی سے گھورتی رہی پھر بڑی ملائمت سے بولی۔

”کیا وہ واقعی ایسی سندر ہے؟“

”ہاں“

وہ خاموش ہو گئی گویا سوچ رہی ہو پھر اس نے مورتی کا رکی بے خواب آنکھوں میں جھانکا طویل سانس لی اور بولی۔ ”ایک شرط“
”وہ کیا؟“ اس نے دل کی دھڑکن کو دبا کر پوچھا۔

”میں اسے دیکھوں گی اگر وہ واقعی اتنی ہی سندر ہے اور میرے بالوں کا جل لالی بندیا اور پائل کی حقدار..... تو میں یہ سب بخوشی دے دوں گی یہ دان نہیں ہوگا۔ میں نے ہمیشہ اپنے انگ کے دام وصول کئے ہیں ایک تحفہ میری طرف سے بھی ہو جائے۔“ وہ ہنسی۔

”منظور ہے“ وہ جلدی سے بولا ”چلو“

چلنے سے پہلے اس نے نائیکہ کو کمرہ کی چابی تھماتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں نہ لوٹی تو یہ کسی اور کو دے دینا“ کسی مجھ ایسی ہی ضرورت مند کو۔“

”کیا مطلب؟“

”سیدھی سی بات بال کا جل بندیا لالی..... یہ سب دے کر میں یہاں واپس آنے کے قابل نہ رہوں گی۔“

”تو؟“

”دیکھا جائے گا۔“ وہ پر متانت لہجہ میں بولی۔

دونوں خاموشی سے بستی کی گلیوں سے گزر رہے تھے۔ ویشیا بستی میں نہ آ سکتی تھی۔ اس لئے وہ لمبا گھونگھٹ کاڑھے بیاتہا کی مانند اس کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ مگر پائل کو کون چپ کرا سکتا تھا عورتوں نے چونک کر تو مردوں نے پلٹ کر دیکھا کسی کے لامبے چمکیلے سیاہ بال پلو سے یوں تو نہ کبھی پھیلے تھے۔ چولی میں کسی کی سانولی کمریوں تو نہ چمکی تھی۔ پیٹ کی ناف اتنی گہری تو نہ تھی کہ تیل کی پٹی لی جائے۔ جس نے دیکھا ٹھٹھکا۔

وہ خاموش سر جھکا چلتے گئے۔

مورتی کا رنے کا نچتے ہاتھوں سے دروازہ کے دونوں پٹ کھول کر اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

”اوئی دیا“

وہ خاموشی سے آنکھیں پھاڑے مورتی کو گھور رہی تھی۔ پھر بولی۔

”یہ دیوی تو ناہیں“

”ہاں“ وہ شرمندہ سا بولا۔ ”میں تو دیوی ہی بنا رہا تھا لیکن نہ جانے ہاتھ کیسے بہک گئے اور... اور یہ بن گئی۔“

”مگر ہے تو سندر... ہانا؟“ وہ جوش سے بولا۔ ”بس میرے لئے ہے۔“ وہ اپنی دھن میں گمن بولے جا رہا تھا۔ ”میرے لئے یہ

دنیا کی سب سے سندر ناری ہے۔ میں نے اس کے لئے گھر بار جیون ساتھی چھوڑا پھر خود کو بھی تیاگ دیا۔ بس اس کی خاطر دنیا بھر کی

عورتوں سے دان مانگتا پھر اہوں۔ بالوں کا، جل کا، لالی کا۔“ وہ ہانپ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں چولی کے دھاگے کھولتے ہوئے بولی۔ ”جو کچھ تم چاہتے ہو سب ملے گا مگر کیا تم نے ابھی

تک اس پر غور نہیں کیا کہ یہ تو تم نے میری مورت بنا ڈالی ہے۔ ایک ویشیا کی۔ مورکھ!“

وہ مورت کے ساتھ کھڑی ہو گئی، دونوں جڑواں بہنیں معلوم ہو رہی تھیں۔ ایک سفید دوسری سانولی۔



تیر ہواں برج

عجیب سماں اور عجیب تر منظر تھا، سب کچھ ہونے کے باوجود بھی کمی کا احساس کرچی کی مانند چھن پیدا کر رہا تھا۔ چھتر چھایا سے محروم اشجار کی جڑیں مردے کی سوکھی اور مڑی مڑی ٹانگوں جیسی تھیں، اوپر کو اٹھتی شاخیں گویا دست بدعا کی بے خون انگلیوں کی ہڈیاں ہوں۔ بے شمار اشجار کی جڑوں میں کھردری کھال والے ایسے سانپ کلبلا تے جو عالم جوش میں دم کھڑی کرتے تو وہ جھنجھنے کی مانند بج اٹھتی۔ موت کا یہ زہریلا جھنجھنا ان بے برگ و بار درختوں کی جڑوں میں مسلسل بجتا رہتا، بے مہک جنگل کی مردہ ہوا سانپوں کے جھنجھنے کی آوازیں اوپر نیچے دائیں بائیں لے جاتی، بے رنگ باغ میں سانپوں کے جھنجھنے مسلسل گونجتے رہتے، یہ اس منظر کا حصہ بن چکے تھے۔ اگر کبھی اچانک ان جھنجھنوں کی آوازیں بند ہو جاتیں تو بے مہر باغ کے باسی چرند پرند پریشان ہو جاتے، کان کھڑے کرتے، تھو تھنیاں اٹھا کر گمشدہ جھنجھناہٹ کو گمشدہ مہک کی مانند تلاش کرتے۔

نگلی شاخیں اور بھری بیلین باہم آمیز گویا ناگ ناگن ملاپ کی سسکاری بھر رہی ہوں۔ اندھے بھکاری کے بدرنگ کٹورے جیسے بے رنگ پھول خوشبو نا آشنا، ہریالی سے محروم سیاہ زمین ایسی گویا لاوے نے بننے کی ٹھانی مگر بہہ نہ سکا اور منجمد ہو گیا۔ لاوا دھرتی کی دراڑوں، درزوں، سوراخوں میں ہزار پابرام کرتے اور سیاہ بچھو آ رام۔ یہ بچھو باہر آتے تو زہر بھری مالا کے مکے زہریلی پچکاریاں چلاتے، جس پر زہر کی ایک بوند بھی پڑ گئی وہ گیا کام سے کہ زہر کی بوند کھال چیر کر دوسری جانب نکل جاتی۔ بد ہیئت ناگ پھنیوں کے سایہ میں سنبولے کلاکاریاں مارتے۔ جس سے بوجھل فضا، پسینہ میں تر جسم میں ایسی چھبھاہٹ پیدا کرتی کہ تن کسی اور کا غلیظ شریر محسوس ہونے لگتا۔ سورج آگ کا گولہ بن کر، تمام غضب دھوپ اور تمام غیض گرمی کی صورت میں لاوا دھرتی پر اتار رہا تھا، زمین لوہے میں تبدیل ہو گئی ایسا لوہا جسے اوپر اور نیچے سے تپایا جا رہا ہو۔ رات آتی تو چاند کوڑھی کے زخم کی مانند اور چاندنی مردہ کے کفن جیسی میلی میلی محسوس ہوتی۔ گرمی اور جس سے گھبرا کر لاوا دھرتی کی درزوں سے موٹے موٹے سیاہ چیونٹے، بوکھلا کر قطار در قطار باہر نکلتے سرد اور پر سکون درز کی تلاش میں، مگر بے سود۔ بھسم ہو کر سیاہ زمین پر سیاہ لکیر میں تبدیل ہو جاتے۔ یہ خطہ بے آب بالعموم بادلوں کی ٹھنڈی چھتری سے محروم رہتا، کبھی بادل آ بھی جاتے تو نیچے بے رنگ دھرتی کا آئینہ بن جاتے۔ گندی کثیف روئی جیسے بادلوں سے گرم اور بوجھل بوندیں زخموں کی پیپ کی مانند رستیں۔ دراڑوں، درزوں اور سوراخوں میں سے ہزار پاب، بچھو، سانپ اور چیونٹے باہر نکل آتے مگر

گرم بدبودار بارش سے نہال ہونے کے برعکس نڈھال ہو جاتے البتہ ناک بھنی کو یہ بوندیں راس آتیں۔

یہ تھا وہ کریمہ خطہ جہاں مسافر نے خود کو پایا۔ مسافر پر کھوں کی بستی میں زیست کرنے کے لائق نہ تھا کہ وہ بدکار ریاکار اور خطا کار نہ تھا لہذا ایک شب بستر سے اٹھا اور گھر سے یوں بے آہٹ نکلا گویا مال مسروقہ لے جا رہا ہو۔ دیس نکالا لے کر سفر کے ہرج مرج کیہنچے تو شاد ہوا اور گرم لہو کی دھمال پر چلتا گیا۔ عالم مستی میں دیوانہ وار تسبیح روز و شب پر یوم شماری بھولا، انجانی جستجو انگلی تھا مے کھونٹ کھونٹ اڑائے لئے جا رہی تھی۔ راستہ میں خوشنما مناظر ملے ایسے کہ من کا پیہا چھبھا اٹھے۔ برقانی پانی والے گہرے کنوئیں اور جل میں جوالا جگاتی سخت چھاتیوں نرم کولہوں اور ملائم پیٹ والی چنچل آنکھڑیوں سے پیغام دیتیں ناریاں۔ وہ نہ رکا۔ سر کا سودا پاؤں کا چکر بن گیا، وہ نہ رک سکتا تھا۔ کبھی کبھی تھکن سے چور جسم کی اینٹھن لئے بازوؤں کا تکیہ بنائے ستاروں میں کھویا ہوتا تو بستی کی وہ مرد و عورت یاد آتی جو جادو گرئی سمجھی جاتی۔ جس سے سب خائف رہتے اور اسی لئے وہ بستی میں بسرے لائق نہ تھی۔ وہ کھوسٹ رستہ کاٹ جاتی تو سمجھا جاتا سفر کھوٹا ہو گیا۔ لہذا اسے دیکھ کر راستہ تبدیل کر لیا جاتا۔ اجاڑ برباد مقامات پر جس کسی کو نظر آتی وہ مذہبی دعائیں پڑھتا وہاں سے بھاگنے کی کرتا۔ اس نیم دیوانی کھوسٹ کی بات پر کوئی کان نہ دھرتا مگر اس کے باوجود مدفون ماضی اور نازائید مستقبل کے بارے میں بتانے کی شہرت بھی رکھتی تھی۔

شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ خوش نظر جنگل پر چھائیوں کے جنگل میں تبدیل ہونے کو تھا کہ اچانک وہ نمودار ہو گئی۔ یوں اچانک گویا درخت نے اس کا روپ دھار لیا ہو۔

”تم!“ اس نے لکڑی جیسی سوکھی انگلی اٹھا کر گدھ کی ہنسی سے مشابہ آواز میں کہا۔ وہ خوفزدہ نہ تھا مگر گھبرا گیا۔

”تم! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

وہ خاموش نکلا گیا۔

وہ قریب ہوئی تو جسم سے اٹھتے تعفن کے بھجا کوں کی وجہ سے دم گھٹتا محسوس ہوا، وہ بارہ سگھے کے سینگوں جیسی آڑی لکڑی لئے اسے چپچپاتی چندھی آنکھوں سے گویا اپنی اور کھینچ رہی تھی، کندھے پر ٹکاتا بڑا سا تھیلا جس کے بارے میں یہ باور کیا جاتا تھا کہ وہ دودھ پیتے بچے اٹھا کر اس تھیلے میں ڈال لیتی اور پھر جنگل میں چھپ کر انہیں کوئلوں پر بھون کر کھا جاتی ہے جبکہ کچھ کے بقول انہوں نے اس تھیلے میں غائب ہوتے بھی دیکھا تھا، وہ اس تھیلے میں چھپ کر پل بھر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جا پہنچتی ہے۔ کچھ داناؤں کے خیال میں اس تھیلے میں شجر حیات کے پھل پھول تھے، سالخورہ ہونے کے باوجود صدیوں سے جو زندہ تھی تو اس تھیلے کے کارن!

اس نے بھاگنا چاہا مگر خوفِ مردانگی کے بعید جانا لہذا کھڑا رہا وہ پھر بولی۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو وہاں جانا چاہیے“

”کہاں؟“ پچڑائے ہونٹوں کو زبان سے تر کر کے پوچھا۔

”وہاں جہاں تمہارا مقدر ہے۔“

”مقدر؟ میرا؟“

”ہاں تم عام لوگوں جیسے نہیں الگ ہو جدا ہو۔“

”مطلب؟“

”سب کے بارہ برج ہوتے ہیں مگر تمہارا تیر ہواں برج ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ اس نے پریشانی سے پوچھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو میں کچھ سمجھا نہیں۔“

وہ اسے معلمہ کے انداز میں سمجھا رہی تھی۔ ”عام لوگوں کے مقدر سیاروں، ستاروں کی چال اور ان کے برجوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ جدی، دلو، حوت، حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب اور قوس۔ یہ عام لوگوں کے لئے ہیں مگر کچھ لوگ سورہ، چندرما، راہو اور کیٹو سے الگ زندگی گزارتے ہیں۔ کیوں کچھ لوگ ہمیشہ فاتح ہی رہتے ہیں، کچھ کے قدم دولت چومتی ہے تو کچھ کے خوبصورت عورتیں، کچھ ہمیشہ منحوس ہی ثابت ہوتے ہیں اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی، کچھ ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ کچھ سدا کے روگی تو کچھ آتما ہتھیا کرتے ہیں۔ کوئی عالم، کوئی مظلوم۔ ایسے لوگ عام لوگوں کے بارہ برجوں سے ہٹ کر تیرہویں برج کے زیر اثر ہوتے ہیں۔“

”تیرہواں برج“ وہ اب بھی کچھ نہ سمجھ پایا۔

”ہاں ہاں تیرہواں برج، برجِ حول!“

وہ جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی اسی طرح اچانک غائب ہو گئی گویا پرچھائیاں بن کر شام کے پھیلے سایوں میں چھپ گئی ہو۔ وہ بے اختیار پکارا۔ ”ٹھہرو“

وہ دوبارہ سامنے کھڑی تھی گویا پرچھائیں کے سایہ ہی میں تھی۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی اس نے پوچھا۔ ”مگر میرے لئے ہی تیرہواں برج کیوں؟“

”کیونکہ تم عام لوگوں جیسے نہیں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھر تمہارا برج تو تیرے سے بھی کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ اکیس، بائیس، چوبیس“

وہ ہنسی۔ ”ہاں! میں تو سینکڑوں ہزاروں اور لاکھوں سے بھی الگ ہوں اس حساب سے تو میرا کم از کم ایک سو تیرہ برج ہونا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں۔ بارہ کے بعد صرف تیرہ ہواں برج ہی ہے۔ مقدار کا برج جس سے فرار ناممکن، تم عمر بھر اس کے اچھے یا برے سایہ میں زندگی بسر کرو گے یہ آقا ہے تم غلام، تم اس کے گھوڑے ہو اور تمہاری باگ اس کے ہاتھ میں ہے، تم اس کے کتے ہو اور اس کی سیٹی پر دم ہلانے پر مجبور ہو۔“

”مگر کیوں؟“

”یہ متعین مقدار کا برج ہے اس لئے“

”تو میں؟“

”ہاں تمہارا تیرہ ہواں برج ہے برج ہول“

سفر کے ہرج مرج کھینچتا اب وہ اس خطہ ناخوب میں خود کو پا کر عالم حیرت میں تھا، بازو میں چٹکی بھری تو باور کیا کہ کسی بھیانک سنے کے برعکس وہ بیدار لمحات میں تھا۔ لاوا دھرتی کی دراڑوں سے ہزار پائے سوراخوں سے سیاہ بچھو اور درزوں سے چیونٹے اسے دیکھ رہے تھے۔ بے مروت درختوں کی پھیلی انگلیوں سے لپٹے سانپ اسے دیکھ کر شوکے۔ شاید خیر مقدم کو! ناگ پھنی کی چھتریاں آنکھوں میں تبدیل ہو کر اسے گھورے جارہی تھیں۔ حیرت کے بھرپور وار نے اسے گنگ کر دیا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ طویل سفر میں وہ ناممکن کے متعدد روپ، اچنبھے کے کئی تماشے اور انہونی کے بہت سے سوانگ دیکھ چکا تھا۔ چلو ایک تماشا اور سہی! لہذا ادھر ادھر سن گن لیتا پھرا۔ باولی دیکھی تو جھجک کر رک گیا۔ زمین کے اندھیرے سینے میں اترتی، ناموار پتھروں کی تنگ سیڑھیاں نیچے اترنے کی دعوت دے رہی تھی۔ وہ کھڑا سیڑھیاں نکا کیا، نیچے اترے یا نہ اترے، پھر ہمت باندھی، جی کڑا کیا اور پہلی سیڑھی پر قدم دھر دیا، پرندوں کی بیٹوں کی بدبودار لپ کی وجہ سے سیڑھیاں پھسلنی ہو رہی تھیں مگر وہ آہستہ آہستہ دیوار کا سہارا لئے قدم قدم نیچے اترتا گیا۔ بڑھتے اندھیرے کے ساتھ گھبراہٹ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا، نیچے ہوتے ہر قدم کے ساتھ خٹکی اور نامانوس بو میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ان سب کی وجہ سے دل کی دھڑکن میں بھی!

کسی نادیدہ ڈور سے بندھا وہ اترتا گیا۔

”اوہ“ پکرا کر رک گیا۔

سامنے روشنی کے ہالے میں چمکیلے پانی کا دائرہ تھا۔ جس میں چھوٹی بڑی بدرنگ بدہیت مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ پانی پینے کا جھکا دیکھا، غور کیا، یہ مچھلیاں نہ تھیں بلکہ فگار انگلیاں کٹے باز و دریدہ رانیں اور مجروح پنڈلیاں زندگی سے بھرپور پانی میں ڈوبتی ابھرتی نظر آرہی تھیں۔

”اوہ“ خوف زدہ سوکھے حلق سے نکلا۔

پھر نہ جانے کہاں سے اور کیسے انسانی سروں کا آبشار پانی میں آن گرا۔ کھلی آنکھیں پھٹے ہونٹ کٹے کان چری ناک کھڑے بال۔ ایک کے اوپر ایک لڑھکتے چلے آرہے تھے۔ عین اس وقت چمکاڈوں کے جھنڈ نے حملہ کر دیا۔ چیخ کر بھاگا تو کئی گردنوں سے جو قہقہے بلند ہوئے وہ دیر تک تعاقب میں رہے۔ ایسے قہقہے جو کسی انسانی حلق سے آج تک خارج نہ ہوئے۔

تو کیا یہی ہے تیر ہواں برج ہول!

مگر میں نے ایسا کیا گناہ کیا جس کی یہ عقوبت ہے۔ نیم دیوانی جادوگر نے کہا تھا۔ ”یہ مقدر ہے“ مقدر جو کبھی روگ ہے تو کبھی بھوگ! ہونی نہ ہونی اور انہونی! یہ سب تیر ہویں برج کی چیتکار ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولی تھی۔ ”ہر شخص اپنے مقدر کے مطابق تیر ہویں برج کو نام دیتا ہے اور تم نے اسے برج ہول کا نام دیا ہے۔“

”مگر مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم“ میں کیا جانوں بارہ برجوں یا تیر ہویں برج کو۔“

”یہی تو مزے کی بات ہے تم کچھ نہیں جانتے۔ تمہیں کچھ نہیں معلوم اور اس کے باوجود تم اپنے تیر ہویں برج کو نام بھی دے چکے ہو۔ برج ہول“

برج ہول! برج ہول! برج ہول!!!

شجر، شاخیں، ناگ، پھنی، کوڑیا لے بھی چلا رہے تھے؟ یا بڑھیا کے الفاظ کی بازگشت ہنوز جاری تھی۔ مسافر نے خوف کے دلدل میں دھنستے اعصاب سمیٹے اور دھیرے دھیرے محاط قدموں سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ مگر اشجار اور حشرات نے کچھ تعرض نہ کیا۔ آہستہ آہستہ خوف زائل اور اعتماد بحال ہوتا گیا۔ جھجک والے کمزور قدم مضبوطی سے زمین پر پڑنے لگے وہ بڑھتا گیا اور پھر اچانک رک گیا۔ گویا دھرتی نے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔

”اوہ“ عالم حیرت میں کھلے منہ سے نکلا۔

سامنے شکستہ مندر تھا، موسم کی مار کھائی دیواروں میں آڑھی ترچھی لکیروں کی صورت میں دراڑیں اوپر اٹھتی جا رہی تھیں جن میں

سے لاش کے بالوں جیسی بیلین نکل کر اطراف میں ریختی چلی گئی تھیں۔ ایسے دیرانے اور ایسے سے میں ایسا مندر ہی ہونا چاہیے تھا یوں محسوس ہوتا گویا ارد گرد کے ماحول نے ہی اس مندر کو جنم دیا ہو۔

وہ ٹوٹی سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ مردہ کائی سے ڈھکی بدرنگ سیڑھیاں گویا کراہ رہی ہوں۔ بے چوکھٹ، بے کواڑ، بے زنجیر در سے اندر داخل ہوا تو پھر حیرت کا جھٹکا لگا۔ استھان پر گردن کے بغیر، عالم نزاکت میں سندری، سنگی مجسمہ کی صورت میں ایستادہ تھی۔ گول بھر بھری رانیں، ناف کا گہرا سوراخ، اوپر کو انھی دودھ بھری چھاتیاں گویا پھلکنے کو ہوں۔ ایک ہاتھ یوں اٹھا گویا اشارہ کر رہی ہو یا پاس سے ہٹا رہی ہو یا پھر آشیر باد دے رہی ہو۔ نظریں انگ کا کساؤ، گات کی سختی اور پیٹ کی نرمی محسوس کر سکتی تھی۔ اٹھے ہاتھ کی کھلی انگلیوں کے پوروں میں دوڑتے خون کی سنسناہٹ سنی جاسکتی تھی اور ناخنوں کے پیار بھری چھن محسوس کی جاسکتی تھی۔ دوسرا ہاتھ سینہ کی جانب یوں اٹھتا ہوا گویا تارنگہ ہٹا رہی ہو۔ ایک پاؤں یوں اٹھا گویا استھان سے نیچے اترنے کو ہو، سختی سے مکی دوسری ٹانگ کی سنگی پنڈلی کی سڈول مچھلی کا ابھار ہلتا نظر آئے۔

”اوہ“ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

ٹوٹی چھت کے دائرہ سے روشنی نرم پھوار کی مانند برس رہی تھی۔ سندر نار اس روشن پھوار سے اشان کر رہی تھی۔

”اوہ“ حلق سے خفیف سی آواز نکلی۔

اندر کا منظر باہر کے بالکل برعکس تھا۔ کچی زمین سے تازہ گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو تنے اعصاب پر خوشگوار اثر کر رہی تھی۔ دیواریں خوش رنگ اور خوش مہک پھولوں والی بیلوں سے ڈھکی تھیں۔ سفر کی تکلفت اور خوف سے جسم آزاد ہوتا محسوس ہو رہا تھا، ٹوٹی چھت کے دائرے میں یہ آسمان کی نیلا ہٹ چمک رہی تھی۔ نیلگوں دائرہ میں پرندہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ یہ کون ہو سکتی ہے۔ دیوی؟ اگر دیوی تو کیا لکشمی، پاربتی یا سرسوتی؟ اگر نار تو کس منچلے کی کلپنا کا چیتکار ہے؟ جو بھی تھی اس کی من موہنی صورت دل کو اپنی اور کھینچے جا رہی تھی اور دل کو بھی یوں کھینچنا خوش آ رہا تھا۔ دیوار سے ٹیک لگائے، نیم دراز، نرم گھاس کے فرش پر عالم آسودگی میں وہ اسے تکے جا رہا تھا۔ کاش اس کا سر بھی ہوتا تو سراپا مکمل ہو جاتا۔ میں اس کی سندر تا کے سامنے سیس نوا دیتا۔ مہربان دھوپ، خوشگوار مہک، من موہک روپ، عافیت اور شانتی کا مدھر احساس اسے تھپکیاں دے رہا تھا۔ آنکھیں خود بخود بند ہوتی جا رہی تھیں۔ تنے اعصاب، اٹھنے اعضاء اور تنی رگوں سے دوسوے خوف اور تھکن نچڑتی جا رہی تھی۔ ابھی وہ شانتی کے ساگر میں شانت ہونے ہی کو تھا کہ بند ہوتی آنکھیں پوری قوت سے کھل گئیں۔

مجسمہ بے سر نہ تھا۔

چمکیلے بالوں کے سیاہ ہالہ میں نمکین مکھ دک رہا تھا۔ بڑی بڑی کٹورا آنکھیں اپنی اور کھینچ رہی تھیں۔ وہ خود کو سیاہ بھنورا آنکھوں میں بھنور میں غرق ہوتا محسوس کر رہا تھا مگر غرق ہونے سے خود کو روکنے پر بھی تیار نہ تھا کہ اس ڈوبنے میں عجب رس تھا۔ سیاہ بالوں کا آبشار سر کشیدہ چھاتیوں پر چمکیلی لہروں کی صورت میں بکھر رہا تھا۔ وہ ایک ادا سے گردن میڑھی کئے اسے نکلے جا رہی تھی۔ یہ پل تھا کہ سال، سال تھا کہ صدی، خواب تھا یا خیال تھا، کیا تھا؟

اس نے انگڑائی لینے کے انداز میں دونوں بازو یوں اٹھائے گویا شاخ گل جھوم کر سیدھی ہونے کو ہو، مسافر کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں اس کی تصویر ہر اٹھتے قدم کے ساتھ بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اب تن شجر سامنے تھا، نظروں کے دائروں میں مکمل، جسم کی گرم مہک جھرنے کی مانند شرابور کر رہی تھی، وہ اور قریب ہو جاتی ہے، مسافر مدھرتا سے نین بھنور میں ڈوب رہا ہے۔ تب وہ اس پر چھا جاتی ہے۔ جیسے گھٹا جنگل پر جیسے خوشبو پھول پر، جیسے سراواز پر، جیسے نشہ اعصاب پر۔

وہ گویا الگ وجود کی صورت میں اسے خود میں سماتا دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔ دودھ کنیں ایک دل میں، سانسیں، ماس، مسام یوں ملے کہ غلے اعصاب ایک ہوئے۔ عین اس وقت جبکہ نقطہ عروج کا فوارہ خوشی سے اچھلنے کو تھا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ واپس اپنے نگلی استھان پر تھی۔ من موہنے چہرہ کی جگہ مکروہ بھیا نک چہرہ، جسم کو چیرتی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ بالوں میں سنبو لیے لہر رہے تھے۔ تیز تنفس سے چھاتیوں کے سرے لرزش میں تھے۔ اٹھے ہاتھ میں سیاہ رگیں ابھر آئی تھیں اور جسم نے گویا مگر مچھ کی کھال اوڑھ لی تھی جس پر رچھ جیسے سیاہ بال اگتے دیکھے جا رہے تھے۔ منہ کھلاتو زردی مائل سیاہ دانتوں میں گوشت کے ریزے لرز رہے تھے۔ مسافر نے چیخنے کو منہ کھولا مگر دہشت نے زبان گنگ کر دی۔ خوف سے پھٹی آنکھوں نے اس کے پاؤں پیچھے گھومتے دیکھے پنجنوں کی جگہ ایڑیوں والے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

سب کچھ ایک لمحہ میں ہو گیا۔

وہاں نہ مندر تھا، نہ ٹوٹی چھت سے بکھرتی دھوپ کی نرم پھوار، نہ دیواروں سے لپٹی خوش مہک بلیں، نہ نگلی استھان، نہ سندر نار کا بے گردن مجسمہ۔

لاوا دھرتی کے پھٹے منہ سے آہستہ آہستہ ایک درخت نمودار ہو رہا ہے۔ انسانی ہاتھ کی کھلی انگلیوں سے مشابہ شاخوں پر زہریلی مکڑیاں جالے بنانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ آسمان پر غلیظ بادل جمع ہو رہے ہیں جن سے کثیف چیچپاتی بارش برے گی، لاوا دھرتی

کی دراڑوں، درزوں اور سوراخوں سے ہزار پا، بچھو اور سیاہ چپوئے جشن منانے نکلیں گے، ناگ پھنی نہال ہوگی اور شاخ در شاخ سانپ خوشی سے شوکیں گے۔



نیک پروین

”تم اسے نہیں سمجھ سکو گے۔“ وہ خاموشی سے جلتے سگریٹ کی سرخ نوک کو گھورتا رہا اور اتنی دیر تک گویا سلگتے سرخ نقطے نے اس پر مسمریزم کر دیا ہو۔ آنکھیں بند تھیں یا کھلیں؟ کچھ کہنا نہیں جاسکتا تھا۔ شاید سگریٹ کے بل کھاتے دھوئیں کی لکیر کسی نیلگوں تحریر میں تبدیل ہو گئی تھی پورے انہماک سے جس کا وہ مطالعہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے سر جھٹک کر گویا خیالات جھٹکنے کی کوشش کی۔ ”تم اسے نہیں سمجھ سکو گے“ میں خود بھی نہیں سمجھ سکا۔“

میں نے کچھ کہنے کو منہ کھولنا چاہا مگر خاموش رہا۔ میں اس کا مزاج دان تھا اور جانتا تھا کہ اسے ٹوکناس کی سوچ کے کچے برتن کو توڑنا ہوگا۔ لہذا چپ رہا۔ وہ جیسے خود سے مخاطب تھا۔ ”میں خود بھی اسے نہیں سمجھ سکا اور شاید اسی میں اس کی کشش ہے۔“ اس نے بغیر کش لیے سگریٹ کو الیش ٹرے میں مسلا، وہ اس گہرے انہماک سے سگریٹ مسل رہا تھا گویا سگریٹ کے روپ میں کسی اور کو مسل رہا ہو۔ ریزہ ریزہ کر دینا چاہتا ہو۔ ”غالباً کشش کا لفظ صحیح نہیں۔“ اس نے خود ہی اپنی تصحیح کی۔ ”وہ مجھے عجب طرح سے فسی نیٹ کرتی ہے“ بانٹ کرتی ہے۔ ”وہ لمحہ بھر خاموش رہا۔“ ”کسی آسیب کی مانند“ پھر وہ خود ہی ہنسا۔ ”بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ کسی چڑیل یا بدرو کی مانند۔“ یہ عجیب الفاظ تھے اور ان سے بھی عجیب تر اس کا لہجہ۔ بیوی سے محبت کرنے والے شاید ہی کسی خاوند نے اپنی بیوی کے لیے ایسے الفاظ استعمال کئے ہوں گے ہاں! نفرت کرنے والے خاندانوں کی اور بات ہے، وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”ایک بات تو بتاؤ۔“

”ہوں“

”جس طرح عورتوں پر سایہ ہوتا ہے اور ان پر جن عاشق ہوتے ہیں کیا اسی طرح مردوں پر بھی چڑیلیں عاشق ہو جاتی ہیں۔“ میں نے قہقہہ لگایا۔ ”مجھ جیسے کالے بھتے پر کوئی چڑیل بھی عاشق ہونا پسند نہ کرے گی مگر یا تم تو ہی مین ہو، سیکسی ہو، تم پر کسی پری ہی کو عاشق ہونا چاہیے۔ ویسے تم پر پریاں تو مرتی بھی رہی ہیں۔“

”پریاں؟“ اس نے پر خیال انداز میں یوں دہرایا گویا زبان پر لفظ کا ذائقہ محسوس کر رہا ہو۔ ”پریاں“ اس نے کافی کا گھونٹ بھرا پھر بولا۔ ”نہیں پریاں نہیں! وہ تو اچھی ہوتی ہیں، مجھ پر تو کسی کھل پائی ہی کا سایہ ہوگا۔“

جامہ زیب اور کامیاب انسان نہ ہوتا تو وہ ”میں“ ہوتا۔ ادھر میری نیل جیسی ناتواں شخصیت کے لیے خاور کی پر جوش اور جارح شخصیت مضبوط سہارے کا کام کرتی، میں زندگی میں ”وہ“ تو نہ بن سکا، بن سکتا ہی نہ تھا۔۔۔۔۔ تاہم میں اس کا واحد راز دار تھا۔ مجھے وہ تمام خفیہ باتیں یوں سناتا گویا کنویں میں پتھر پھینک رہا ہو۔ میں واقعی قابل اعتماد امین تھا کہ اس کے رازوں کی امانت میں کبھی خیانت نہ کی۔ یہی نہیں بلکہ یہ خفیہ باتیں اور راز میرے لیے نفسیاتی تسکین کا بھی ایک ذریعہ تھے بالواسطہ قسم کی تسکین، محروم لذت کی تشفی!

میں اپنے مشاہدات اور تجربات کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں بلکہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ کچھ مٹھے ایسے ہوتے ہیں جو متحرک، خوش اور زندہ رکھتے ہیں اور کام کی نوعیت یا ماحول کی وجہ سے انسان سدا بہار رہتا ہے جیسے فلم، ٹیلیویژن، ایڈورٹائزنگ، فیشن، فوٹو گرافی، ڈریس ڈیزائننگ اور کالم نگاری وغیرہ جبکہ بعض پیشوں کی نحوست آکاس نیل کی مانند شخصیت سے تمام رس چوس لیتی ہے۔ ایسے مٹھے جہاں خوبصورت بات اور جمالیاتی تصورات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سرفہرست تو خود میرا اپنا پیشہ ہے یعنی معلمی، اگر بعض پروفیسروں نے اپنی طرح دار شاگردوں سے شادی کر لی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ بڑا گیمرس پیشہ ہے (اور پھر ایسے پروفیسروں کو کس بھاؤ پڑتی ہے اسے کون جانے؟) نژاد نو کی تربیت، مستقبل کی معماری، قوم کی سربلندی، علم کی دولت وغیرہ کو چھوڑیے اصل بات یہ ہے کہ پروفیسری مرد کو ”کچھ اور“ بنا کر نرا پروفیسر بنا دیتی ہے، خوف کا مسلسل اسیر، کلاس میں لڑکوں کا خوف، کالج میں پرنسپل کا خوف، ہڑتال کروانے والی مذہب نماسی، جماعتوں کا خوف، حتیٰ کہ گھر میں بیوی کا خوف۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو اور یہ میری فرسٹریشن ہو کہ میں ایک معزز مٹھے کے بارے میں ایسی بے تکی سوچ رکھتا ہوں۔ وجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر میں یقیناً اپنی پروفیسری سے اکتایا ہوا تھا اس لیے خاور کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میرے لیے جنت نگاہ تھی۔ میں جب بھی اکتاتا (اور میں اکثر اکتایا ہی رہتا ہوں) خصوصاً میں جب بھی بیزار ہوتا (میں اکثر بیزار ہی رہتا ہوں) یا میں جب بھی بور ہوتا (میں اکثر بور رہتا ہوں) تو خاور ایڈورٹائزنگ ایجنسی (KAA) میں جا پہنچتا۔ اس کا پوسٹ دفتر، دفتر نہیں راجہ اندر کا اکھاڑا تھا۔

آتی نئے انداز سے اب سبز پری ہے

پر سبز ہیں لب سرخ ہیں پوشاک ہری ہے

امانت کی ”اندر سجا“ کے جو اشعار میں نالائق لڑکوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ان کا عملی روپ مجھے یہاں نظر آتا۔ کیونکہ ادب کا استاد تھا اس لیے میرے لیے اشعار کی زندہ تصویریں دیکھنا، اشعار کی عملی تشریح بلکہ چلتے پھرتے اشعار دیکھنا بہت ضروری تھا، اسی لیے فارغ اوقات میں، میں عموماً وہیں پایا جاتا تھا بلکہ کبھی کبھار کسی پروڈکٹ کے سلوگن یا ”جنگل“ وغیرہ کے سلسلے میں ادبی نوعیت کا مشورہ

قدم ٹھٹھکیں گے عورتوں کی آنکھ میں حسد کی چنگاری نہ سلگے گی حتیٰ کہ مجھ جیسے پروفیسر کی عینک کا شیشہ بھی کر یک نہ ہوگا، بس ایسی ہی تھی وہ جیسی کہ ”باقی عورتوں“ کی اکثریت ہوا کرتی ہے بے رنگ روپ، کشش ثقل سے عاری!

خاور کی تو اور بات ہے میں معنک پروفیسر بھی اس میں دلچسپی نہ لے سکتا تھا۔ ویسے وہ روایتی معنوں میں بد صورت بھی نہ تھی۔ یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ بد صورتی میں بھی ایک اپنا رمل قسم کی کشش ہوتی ہے جر مرد کے اعصاب پر عجب جارحانہ انداز سے اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ خوب صورت مرد پر اور طرح سے اور بد صورت مرد پر اور طرح سے! لہذا میں خالص بد صورتی کا احترام کرتا ہوں۔ جس طرح خالص حسن نایاب ہے اسی طرح خالص بد صورتی بھی کمیاب ہے اور یہ ان دو انتہاؤں کے درمیان کہیں بھی فٹ ہو سکتی تھی اس پر مترا داس کی خاموشی، بعض گفتار کی غازی ثابت ہوتی ہیں اور باتوں کی پھلجھڑی سے صورت کے مدہم خاکہ میں شوخ رنگ بھر لیتی ہیں۔ یہاں یہ خانہ بھی خالی پہلی مرتبہ آئی تو صوفہ پر سگری بلکہ سہی سہی بیٹھی رہی، دونوں ہاتھ گود میں رکھے، وہ ہر بات کرنے والے کا گویا حیرت سے منہ تکتے لگتی اور پھر گھبرا کر یوں نظریں جھکا لیتی کہ دیکھنے کی چوری نہ پکڑی جاسکے۔ کسی بات پر قہقہہ لگتا تو وہ بھی مسکرا دیتی، چہرہ کا روپ بدل دینے والی مسکراہٹ کے برعکس نام نہاد سی مسکراہٹ اور اس علامتی مسکراہٹ کے بعد بھی وہ جیسے نخل سی ہو کر مزید سٹ جاتی۔

”یار! یہ کیا چیز تھی؟“ اس کے جانے کے بعد میں نے خاور سے پوچھا۔

وہ کندھے اچکا کر بولا۔ ”ڈونٹ نو! وہ شاہدوں کے ساتھ آئی تھی، کالج کی سہیلی ہے، یہاں کسی سکول میں استانی ہے اور کسی گریڈ ہاسٹل میں رہتی ہے۔“ وہ لا تعلقی سے اس کا باؤڈیا سنار ہاتھ تھا۔

”یہ شاہدہ تو بڑی شے ہے۔ یہ اس نے ساتھ کیا لگا رکھی ہے۔“

”دوستی کا بھی عجیب معاملہ ہے۔“ خاور فلسفیانہ لہجہ میں بولا۔ ”بعض دوست ہم خیالی کی وجہ سے بنتے ہیں بلکہ بعض....“ اسے مناسب لفظ نہ ملا تو میں نے لقمہ دیا۔

”بد خیالی کی وجہ سے۔“

وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ”بس! یہی سمجھ، یعنی کوئی بات مشترک نہیں ہوتی اور اسی لئے وہ گہرے دوست ہوتے ہیں، یعنی ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔“

”جیسے ہم دونو!“

وہ جلدی سے بولا۔ ”میرا یہ مطلب نہ تھا۔“

”یہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا تمہارا بھی یہی معاملہ ہے اور شاہدہ اور.... کیا نام ہے اس کا؟“

”نام؟“ وہ ذہن پر زور دے کر بولا۔ ”لو! اس کا تو نام بھی یاد نہیں رہا۔“

اور خاور کو جس کا نام بھی یاد نہ رہا تھا جب چند ماہ بعد خاور نے اسی سے شادی کر لی تو یقیناً یہ ایک تعجب خیز دھماکہ خیز سنسنی خیز بلکہ ہر طرح کی ”خیز“ خبر تھی۔ خاور اور شادی؟ ممکن تھا مگر خاور کی اس سے شادی؟ ناممکن! حقیقی زندگی میں تو نہیں فلموں میں ایسے ملازم مل جاتے ہیں جو کنبہ کے فرد کی مانند ہوتے ہیں اور انہیں ملازم نہیں بلکہ گھر کا فرد یا پھر بزرگ سمجھا جاتا ہے اور رمضان بھی ایسا ہی ملازم نما بزرگ تھا۔

خاور جیسے لا ابالی انسان کے لئے رمضو بابا نعمت سے کم نہ تھا۔ رمضو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

”کئی مہینوں بعد آپ آئے ہیں.... ہیں نا؟“

میں نے بتایا گرمیوں کی چھٹیوں میں، میں بھائی کے پاس امریکہ گیا تھا۔ وہ چائے لے آیا، پتہ چلا میاں بیوی مری گئے ہیں۔

”خاور نے بیاہ کر لیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں!“ وہ خوشی سے چمک کر بولا۔

”کیسی ہے ہماری بھابھی؟“

”آپ ملے ہوں گے ان سے، بہت اچھی ہیں جی وہ!“

”کیا نام ہے؟“

”پروین۔“

میں اس نام کی کسی ماڈل اور گلیمر گرل سے واقف نہ تھا لہذا پوچھا۔ ”پروین... کون پروین؟“

”وہ جی!“ وہ اپنی مالکن کا حلیہ کیسے بیان کرتا۔ ”وہ جی سانولی سی جی.... وہ جی....“

تب وہ یاد آئی ”وہ جو استانی ہے؟“

”جی ہاں! مگر اب انہوں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔“

”ظاہر ہے اب بھلا نوکری کی کیا ضرورت۔“

اچھا جیسے گرم چائے ٹھنڈی ہو گئی، اگرچہ یہ خاور کا ذاتی معاملہ تھا مگر مجھے اچھا نہ لگا، ایک تو اس لئے کہ مجھے قریبی دوست اور رازدار سے بھی اسے راز رکھا گیا۔ اس خلیجان سے قطع نظر اس لئے بھی کہ خاور جیسے خوبصورت مرد کے لئے وہ چھپکلی نما عورت قطعاً موزوں نہ تھی۔ خاور کی تو نسل ہی خراب ہو جائے گی۔ بچے کالے پیدا ہوں گے۔ چھپکلی کی تشبیہ اور کالے کلوٹے بچوں کی تصور سے میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔

”رمضو بابا! یہ سب کیسے ہو گیا؟“

”کیا کیسے ہو گیا؟“

یہی یا شادی میرا مطلب ہے اتنی جلدی خاموشی سے!“

”وہ جی دراصل پروین بیٹی میں“

”بیٹی؟“

”وہ جی انہوں نے بی بی جی نے مجھے اپنا باپ بنا لیا ہے۔“

”باپ۔“

”وہ جی ... وہ کہتی ہیں مجھے ان میں اپنا مرا ہوا باپ نظر آتا ہے۔ وہ مجھے بابا جی کہتی ہیں۔“

”اچھا! تو یہ بات ہے۔“

”جی! وہ پروین بیٹی بہت اچھی ہیں، بہت ہی اچھی، ان آوارہ لڑکیوں کی طرح نہیں جو ہر وقت خاور صاحب کو گھیرے رہتی تھیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی میں یہ شادی سمجھ نہیں سکا۔“

”پروین بیٹی جی بہت نیک ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی“

”دراصل پروین بیٹی خاور صاحب کا بہت خیال رکھتی تھیں۔“

”تھیں؟“

”ہاں جی! میرا مطلب ہے شادی سے پہلے۔“

شادی سے پہلے بھی“ میں خاصا بے خبر ثابت ہو رہا تھا اس کم بخت خاور نے مجھے اس معاملہ سے دور ہی رکھا۔

”یہ ہوا کہ ایک دن پروین بیٹی آئی۔“

”تم تو حیران ہوئے ہو گے۔“

رمضو ہنسا۔ ”جی ہاں! یقیناً! اس لئے کہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہ تھی جو یہاں آتی رہتیں تھیں۔“

”یقیناً وہ ان لڑکیوں میں سے نہ تھی جو یہاں آتی رہتی ہیں۔“ میں نے دہرایا۔

”میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا بھی نہ تھا اس لئے میں خاصہ حیران ہوا، اس نے بتایا کہ وہ دفتر میں خاور صاحب سے مل چکی ہے

پھر اس نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔“

”کس قسم کی“

”الگ قسم کی.... خاور صاحب کیسے کھانے پسند کرتے ہیں، ناشتہ میں کیا لیتے ہیں، بس ایسی باتیں جیسی گھریلو عورتیں کیا کرتیں

ہیں، بیویاں کیا کرتی ہیں اور استانیاں کیا کرتی ہیں، وہ پھولوں کا گلہ سہ بھی لائی تھی جسے اس نے خود ہی خاور صاحب کے بیڈروم میں جا

کر سجا دیا۔“

”خاور نے پھولوں کا پوچھا نا!“

”پوچھا جی، میں نے بتا دیا پروین بی بی لائی ہیں۔“

”بس اسی طرح وہ آتی رہی پھر اس نے خاور صاحب کو پسند کے کھانے لانے شروع کر دیئے۔“

”خاور نے پوچھا ہوگا؟“

”جی ہاں، پوچھا جی! میں نے سب کچھ بتا دیا کہ یہ سب پروین بیٹی کر رہی ہے۔ پھر ایک دن آئی تو میری طبیعت خراب سی تھی سو

اس نے کھانا پکا دیا۔ پھر آ کر سارا گھر جھاڑ گئی۔“

”پوچھا تو ہوگا کہ یہ سب کیوں کرتی ہو؟“

”جی پوچھا جی! کہنے لگی میں ہوسٹل میں رہتی ہوں، وہاں میری کوئی سہیلی نہیں، میرا دل نہیں لگتا وہاں، اک دن اس نے تقریباً روتے

ہوئے بتایا کہ میرا کوئی گھر نہیں نہ گھر والے... اس لئے اس طرح سے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔“

”اور خاور؟“

”سب معلوم تھا اگرچہ اس نے مجھے منع کر رکھا تھا کہ میں اس کے بارے میں خاور صاحب سے کوئی بات نہ کروں مگر مجھے بھلا

بات چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”بھلا تمہیں بات چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”پھر سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے وہ بیٹیوں جیسی لگتی تھی۔ اس کے آنے سے اکیلے گھر میں میرا بھی جی بہل جاتا۔ وہ بھی باپ کی طرح میرا خیال رکھتی، میرے لئے کپڑے لاتی، مجھے کمزور دیکھ کر طاقت کی دوا لادی۔“

”خاور نے کوئی اعتراض نہ کیا۔“

”انہیں اعتراض کی ضرورت نہ تھی اگر وہ پھول لاتی تھی یا ان کا پسندیدہ کھانا پکا جاتی تھی یا ڈرائنگ روم کو ٹھیک ٹھاک کر دیا تو اس میں خاور صاحب کو کیا تکلیف ہو سکتی تھی۔“

”ہاں! اسے بھلا کیا تکلیف ہو سکتی تھی۔“

”مجھے تو وہ بار بار یہی کہتی کہ خاور صاحب کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ دراصل جی وہ بڑی گھریلوں تھی اور اسے گھر کا کام کاج کرنا اچھا لگتا تھا، لفتگی نہ تھی۔“

اس پر میں ہنسا۔ رمضو کا بیان جاری تھا۔

”شروع شروع میں تو خاور صاحب کچھ کچھ بولے کہ وہ یہ سب کیوں کرتی ہے، مگر پھر خاموش سے ہو گئے۔“

”اور اس کا سالن کھا لیتے؟“

”تو اور کیا... پھینک دیتے۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“

”اور وہ گھر ہی پر آتی تھی؟“

”جی گھر پر اور اس وقت جب خاور صاحب گھر پر نہ ہوتے۔“

”دفتر نہیں جاتی تھی؟“

”میرا تو خیال ہے، نہیں!“

”وہ ایسا کیوں کرتی تھی، تم نے اس سے پوچھا تو ہوگا؟“

رمضو بابا خوب ہنسا، ”کہنے لگی مجھے خاور صاحب سے ڈر لگتا ہے اس لئے میں دفتر نہیں جاتی۔“

”تم نے پوچھا نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے خاور غصیل! یا بد مزاج انسان تو نہیں ہے۔“

”میں نے پوچھا کہنے لگی وہاں بڑی بڑی خوبصورت لڑکیاں آتی ہیں تیز طرار جامہ زیب، ہیمز سٹائل والیاں اور میں تو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔“

”کمال ہے!“

”سلیم صاحب! میں جی خوبصورتی اور بدصورتی تو نہیں جانتا لیکن پروین بیٹی کمال کی ہیں اتنی گھڑ اتنی خدمت کرنے والی اتنی اچھی اتنی اچھی کہ جتنا جھوٹ بولو۔“

”اتنی اچھی کہ جتنا جھوٹ بولو۔“ میں نے زیر لب دہرایا۔ ”رمضو بابا! تم عجیب فلسفہ بولے ہو اس وقت۔“

رمضو بابا ہنسا۔ ”اوجی! میں فلسفہ کیا بولوں گا میں تو بس رمضو بابا ہی ہوں۔“

میں کچھ دیر تک خاموشی سے چائے پیتا رہا پھر پوچھا۔ ”رمضو بابا! چلو تمہاری بات مان لی کہ وہ بہت اچھی اور سلیقہ مند ہے مگر تم خاور کو تو جانتے ہی ہو.... کیسی کیسی خوبصورت لڑکیاں اور ماڈلیں اس کے پیچھے پیچھے پھرتی تھیں مگر وہ کسی کے قابو میں نہ آیا تو پھر شادی....“

رمضو بابا نے جواب دیا۔ ”کیونکہ پروین بیٹی ان لڑکیوں جیسی خوبصورت نہ تھی اس لئے یا تو شادی ہوتی یا کچھ بھی نہ ہوتا۔“

رمضو بابا پھر فلسفہ بول گیا تھا۔ ”مگر پھر بھی رمضو بابا.....“

وہ برا مان کر بولا۔ ”سلیم صاحب! اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ پروین بیٹی نے خاور کو پھانسا تو وہ ایسی نہیں وہ تو صرف خدمت کرنا چاہتی تھی اور ہمیشہ مجھے خاور کو کچھ بھی نہ بتانے کو کہتی رہتی تھی وہ پھل پھول وغیرہ ہمیشہ اپنے پلے سے لاتی تھی۔“

”مگر پھر بھی..“

رمضو بابا اب مجھے باقاعدہ سمجھا رہا تھا۔ ”دیکھئے سلیم صاحب! وہ کوئی ایسی خاص خوبصورت نہیں مگر ایک خوبصورتی اندر کی بھی تو ہوتی ہے دل کی خوبصورتی روح کی خوبصورتی... جس کا لباس اور صورت سے تعلق نہیں ہوتا.... ایسی خوبصورتی جو بس ہوتی ہے۔“

”رمضو بابا! میرا یہ مطلب نہ تھا دراصل میں اب تک اس شادی کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔“

”دیکھئے میں آپ کو سمجھاتا ہوں دو مہینے کی بات ہے خاور صاحب بہت بیمار ہو گئے۔ میں ڈاکٹر کو لے آیا اس نے دوا وغیرہ دی مگر میں بہت پریشان تھا دل میں برے برے خیال آتے“ میں نے کبھی خاور صاحب کو بیمار ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اس لئے میں بہت زیادہ

گھر گیا۔ آپ بھی یہاں نہ تھے ان کے اور کسی دوست رشتہ دار کو جانتا نہ تھا چنانچہ میں سیدھا پروین بیٹی کے ہاسٹل پہنچا اور خاور کی بیماری کا بتایا وہ اسی وقت ان ہی کپڑوں میں میرے ساتھ چلی آئی اور آپ یقیناً مائے ساری ساری رات پلنگ سے لگی بیٹھی رہتی۔ نہ کھانے کی ہوش نہ پینے کی جن کپڑوں میں آئی ان ہی میں رہی اس دوران کچھ لڑکیوں کے فون بھی آئے مگر اس نے کسی کو بھی گھر نہ آنے دیا، اکیلی خدمت کرتی رہی۔“

رمضو بابا اچانک چپ ہو گیا جیسے زیادہ بول گیا ہو یا پھر مزید کچھ کہنا چاہتا ہو اور سوچ رہا ہو کہ یا نہ کہے میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا بالآخر وہ بولا۔

”ایک شام میں کمرہ میں داخل ہوا تو وہ رو رہی تھی۔“

”رو رہی تھی؟ کیوں؟ خاور تو مرنا تھا۔“

اس نے براہمان کر میری طرف دیکھا۔ ”میں نہیں جانتا کیوں؟ بس وہ خاور صاحب کے سر ہانے بیٹھی چپکے چپکے رو رہی تھی میں حیران سا کھڑا رہ گیا۔ عین اسی وقت خاور کی آنکھ بھی کھل گئی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر عجیب بات ہوئی جی، خاور بھی رونے لگا، دونوں ایک دوسرے کو چپ کاتے اور پھر رو پڑتے بالکل بچوں کی مانند جی۔“

”اوہ!“

”بس ٹھیک ہوتے ہی خاور نے شادی کر لی۔“

”اور دونوں خوش ہیں۔“

”خوش؟ جی وہ تو خاور کی پوجا کرتی ہے۔ ہر وقت خاور کا لباس، خاور کے جوتے، خاور کا یہ خاور کا وہ... وہ تو جی خاور کو دیکھ کر جیتی ہے۔“

”چلو اچھا ہوا! خاور خوش تو پھر سب ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

اس کے باوجود میرا اطمینان نہ ہوا۔ سب ٹھیک نہیں تھا کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات تھی جسے میں کیا خود خاور بھی نہ سمجھ سکا تھا۔ رمضو بابا تو بے چارہ محض رمضان خان تھا۔

میں نے دونوں کی دعوت کی!

پروین کو دیکھ کر میں حیران سا رہ گیا۔ آف وائٹ رنگ کے سوٹ میں اس کا نمک بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ کالا نمک چمک رہا تھا!

اندرونی طمانیت اور شادمانی سے یہی نہیں سکڑی سہمی کے برعکس وہ اب پر اعتماد تھی۔ جلد ہی میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ خاور کی چکور تھی۔

”خاور یہ لو! خاور یہ کھاؤ! خاور یہ بہت ٹمسی ہے خاور یہ“

خاور لقمہ کبوتر بنا بیٹھا تھا۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ ”بھائی! خاور کا فیڈ رکھا رہ گیا۔“

خاور نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا وہ میری بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”سلیم بھائی! اب آپ بھی شادی کر لیں۔“

”ارے بھائی!“

میں فقرہ مکمل نہ کر پایا۔ مجھے خاور کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ کم بخت عمر بھر عورتوں کے معاملہ میں ایڈ ونچرس رہا اور اب ایسی اچھی بلکہ اصلاح میں ”پتی ورتا ستری“ مل گئی ایک ہم ہیں کہ نہ لڑکی ملی نہ بیوی۔“

خاور چپک کر بولا۔ ”یہ کم بخت اتنا ست ہے کہ اٹھ کر منہ نہیں دھوتا، بیاہ یا کرے گا۔“

”تو میں تلاش کر دیتی ہوں۔“

”کر دو... مگر اپنی جیسی تلاش کرنا۔“

”کیوں؟“

”تم جیسی بیویاں مرد کا دماغ خراب کر دیتی ہیں اور وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔“

”بالخصوص مرد اگر خاور ہو۔“ میں نے لقمہ دیا۔

کالے نمک پر سرخی کی لہر دوڑ گئی خوشی؟ کامرانی؟ شرم؟ خفت؟

ہم دونوں اپنے پسندیدہ ریسٹوران کے کافی کارنز میں تھے۔

”یار خاور!“ میں نے کہا۔ ”میں اب تک نہیں سمجھ سکا۔“

”کیا؟“

”تمہارا شادی کرنا۔“

”دنیا بھر کے مرد شادی کرتے ہیں اس میں سمجھنے سمجھانے کی کیا بات ہے؟“

”تم دنیا بھر کے مردوں میں سے نہیں ہو، تم ان مردوں میں سے ہو جن کی دنیا اور ہی ہوتی ہے اور اس میں بیوی کی گنجائش نہیں ہوتی۔“

وہ کچھ دیر تک کافی کے کپ کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ”شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔“

”اور اب تم خوش ہو۔“

”بہت۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“

”مجھے جب رمضو نے اس کے گھر آنے، پھول لانے یا کھانا پکانے کا بتایا تو میں نے رمضو کو منع بھی کیا، غالباً اس نے منع نہ کیا اور وہ یہ سب کچھ کرتی رہی۔“

”تم سے ملے بغیر۔“

”ہاں! یہی تو عجیب بات ہے، نہ دفتر آتی نہ میری موجودگی میں کبھی گھر آئی۔ عورت خدمت گزاری یا محبت کرتی ہے تو کم از کم داد تو چاہتی ہی ہے نا۔“

”ہاں! یہ تو ٹھیک ہے۔“

”مگر اللہ کی اس بندی نے کبھی جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا، فون کر کے بھی یہ نہ پوچھا کہ اس کا لایا ہوا سالن کیسا تھا۔“ اس نے خاموش ہو کر کافی کا گھونٹ بھرا پھر بولا۔ ”پہلے پہلی خاصی الجھن سی ہوتی، پھر میں نے سوچا اب نارمل ہے، اگر میری خدمت سے اسے خوشی ہوتی ہے تو میرا کیا جاتا ہے، چنانچہ میں لا تعلق سا ہو گیا لیکن لیکن کچھ عرصہ بعد جیسے مجھے اس کی عادت سی پڑ گئی، میں گھر جانے سے پہلے سوچتا کیا وہ آج پھول لائے گی اگر لائے گی تو کون سے؟ اگر کھانا پکایا ہے تو کون سا؟ کیا پچھلی مرتبہ کی مانند اس مرتبہ بھی نمک کم رہ جائے گا....“ وہ ہنسا پھر بولا۔ ”مجھے اپنی سالگرہ کی تاریخ بطور خاص یاد نہیں، نہ میں نے کبھی سالگرہ منائی ہے لیکن تعجب اس وقت ہوا جب رات کو گھر پہنچا تو چاکلیٹ کیک کے ساتھ پتی برتھ ڈے کا کارڈ میز پر سج رہا تھا۔“

”صرف کیک؟“

وہ ہنسا۔ ”اور کون ہوتا ہے۔“

”اور کیک بھی چاکلیٹ کا.... خاصی علامتی بات ہے۔“

وہ خوشی سے مزید ہنسا۔

”اوجھٹ انسان! تم نے یہ سب مجھ سے چھپائے رکھا۔“

وہ جھینپ کر بولا۔ ”یار معاف کرنا! واقعی میں نے تم سے یہ سب کچھ چھپا کر رکھا۔“

”اس نے منع کیا تھا۔“

”وہ کیوں منع کرنے لگی وہ تو مجھ سے ملتی ہی نہ تھی دراصل....“ وہ نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ ”دراصل یہ ایک ذاتی اور خفیہ سارا تھا

جس میں کسی کو بھی شریک نہ کر سکتا تھا۔“

”ذاتی اور خفیہ راز؟“

”اسے یوں سمجھو بچہ اپنے تمام کھلونے دوسرے بچوں کو کھیلنے کے لئے دے دیتا ہے مگر ایک آدھ ایسا کھلونا بھی ہوتا ہے جسے وہ

سب سے چھپا کر رکھتا ہے اور کسی کو بھی اسے کھیلنے نہیں دیتا۔“

”مس پروین بھی ایسا ہی کھلونا تھی۔“

”ایڈیٹ! وہ کھلونا نہ تھی بلکہ اس کا یہ سب کچھ کرنا یعنی دور رہ کر بلکہ روپوش رہ کر خدمت کرنا میرے لئے ایک خاص طرح کی

لذت میں تبدیل ہو چکا تھا ایک خاص طرح کا تھل محسوس ہونے لگا مجھے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”تم کیا کوئی بھی نہ سمجھ سکتا تھا میں خود عجیب سے سسپنس میں تھا.... اس لئے تو تم سے ہر بات چھپائی گئی تھی۔“ ہم دونوں کچھ دیر

تک خاموش بیٹھے کافی پیتے رہے پھر وہ بولا۔ ”مجھے بخاری دھند میں کچھ کچھ یہ احساس سا تھا کہ کوئی عورت ہے جو میری دیکھ بھال کر

رہی ہے۔ کئی راتوں کے بعد جب ایک رات میں قدرے پرسکون تھا تو میری کھل گئی۔ وہ خاموش بیٹھی آنسو بہا رہی تھی، میں حیرت زدہ

سا اسے دیکھتا رہ گیا، جب اسے میرے جاگنے کا اندازہ ہو گیا تو اٹھنے لگی مگر میں اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر عجیب بات یہ ہوئی کہ میں اسے

چپ کرانے لگا تو میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے سے لپٹے روتے رہے۔“

”رونے والے تجھے کس بات پر رونا آیا۔“

”بکو اس مت کرو! تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔“

”سو تو ہے۔“

”ایک بات اور سنو... یہ پچھلے دنوں کی بات ہے۔“ وہ لمحہ بھر کو جھجکا، بات کہے یا نہ کہے مگر پھر بولا۔ ”ایک رات آنکھ کھلی تو وہ میرے پیرچوم رہی تھی۔ عجیب والہانہ انداز سے دیوانہ وار۔“

”کیوں؟ تم اسے منہ چومنے نہیں دیتے۔“

”خبیث! بدزبانی سے باز آ!“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”وہ تمہاری بھابی ہے۔“

یہی تو مصیبت ہے کہ وہ میری بھابی ہے۔“

اور اب چند ماہ بعد وہ یہ خوشخبری سن رہا تھا۔ ”وہ چڑیل عورت کے روپ میں تمہاری بھابی ہے۔“

”کیا احقناہ بات ہے۔“

”تم مانو گے نہیں بلکہ کوئی بھی نہ مانے گا مگر حقیقت یہی ہے۔“

”کہ بھابھی“ میرے منہ سے لفظ چڑیل ادا نہ ہو رہا تھا۔

وہ پر زور لہجہ میں بولا۔ ”وہ جادو گرئی ہے۔“

”یار خدا کے لئے۔“

مگر وہ اپنی دھن میں بولے گیا۔ ”وہ ویسپائر ہے.... ہاں! مجھے اب اندازہ ہوا ہے شی ازاے تھرٹی ویسپائر۔“

”آخر بات کیا ہے۔“ یہ خاور کا نیا روپ تھا جو پہلے سے بھی زیادہ ناقابل فہم تھا۔ اس نے سگریٹ پھینک کر نیا سگریٹ سلگایا اور

طویل کش لیا۔

”وہ تمہیں تنگ کرتی ہے؟“

”نہیں۔“

”زیور کپڑے کی مرمانش کرتی ہے؟“

”نہیں۔“

”لڑتی ہے؟“

”نہیں۔“

”خدمت میں کی آگنی ہے؟“

”نہیں!“

”تمہاری پوجا کرنے میں کی آگنی ہے؟“

”نہیں!“

”تو پھر یہ کیا بکواس ہے؟“

”یہی تو میں کہتا ہوں کہ اسے سمجھنا آسان نہیں۔“

”تمہیں پتہ ہے میں ”گراپ وائر“ کا عادی ہوں۔“

”ہاں.... تو کیا اس نے چھڑانے کی کوشش کی؟“

”نہیں! چھڑانا کیا اس سے الٹ بات ہوئی۔“

”یعنی؟“

”ایک دن میں گھر آیا تو فریج میں بیڑی کی بوتلیں ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔“

”اور تم اس پر ناراض ہو؟“

”نہیں نہیں! ناراض تو نہیں۔“

”تو پھر؟“

”بس مجھے اچھا نہ لگا۔“

”اس نے بھی ساتھ بیٹھ کر پی؟“

”وہ کافی بھی نہیں پیتی۔“

”تو پھر تمہیں اچھا کیوں نہ لگا؟“

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا، ادھ جلا سگریٹ الیش ٹرے میں پھینکا اور بولا۔ ”یار میری بیوی ہے۔“

”تو؟“

”اسے تو شراب نوشی سے منع کرنا چاہیے نہ کہ.....“

”بھئی عجیب گھامڑ شوہر ہو! میں تمہاری منطق نہیں سمجھ سکا یعنی روایتی بیویوں کی مانند وہ تمہارے ساتھ لڑتی جھگڑتی تو پھر تم خوش ہوتے لیکن دل پر جبر کر کے تمہاری خوشی کی خاطر اور خود شراب گھر میں لے آئی تو ناراض ہو رہے ہو۔“
وہ خاموش رہا۔

”پھر تم نے کیا کیا؟“

”زہر مار کر ناپڑی مگر مرزا نہ آیا۔“

”اوہ! تو یہ تکلیف ہے۔“

”اوسنو....“

”ابھی اور بھی ہے سنانے کو....“

”یار ابھی چند دن کی بات ہے۔“ وہ رک گیا۔

”کہو! کہو!“ شاید اس نے بالآخر کوئی ایسی حرکت کر دی تھی جو نہ کرنی چاہیے تھی۔“

”وہ ایک... ایک عورت لے آئی۔“

”ایک عورت لے آئی.... کیا مطلب؟ گھر کے کام کے لئے؟“

”نہیں بھئی میرے لئے....“

”تمہارے لیے۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟“

”بڑھے گدھے ہو۔“ وہ چڑ کر بولا۔ ”سمجھتے کیوں نہیں..... میرے لئے۔“ ”میرے“ پر زور دے کر بولا۔ میرے لئے

.... میرے لئے۔“

کیا خاور وہ کہہ رہا تھا جو میں سمجھ رہا تھا میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”یعنی کہ تمہارے لئے“ خالص تمہارے لئے۔“

”ہاں! ہاں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”پھر تم نے کیا کیا؟“

وہ بے زاری سے بولا۔ ”مجھے کیا کرنا تھا زہر مار کر ناپڑی مگر مرزا نہ آیا۔“

”خاور حرام زادے! تمہیں اندازہ نہیں کہ تم کتنے خوش قسمت ہو۔“

اس نے غصہ سے میری طرف دیکھا۔ ”خوش قسمت‘ بلڈی ہیل۔“

”ہاں! اور کیا؟“

”تمہیں پتہ ہے اس کا نتیجہ کیا نکلا.... اس دن کے بعد سے نہ تو اپنا گراپ وائر چکھنے کو جی چاہا اور نہ ہی.....“

اوہ! تو یہ تکلیف ہے۔“

”اسی لئے تو کہتا ہوں کہ پروین نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ اس نے مجھے کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ اب میں ایک مرد سے محض ایک

خاوند بن کر رہ گیا ہوں، ماضی کا خاور مرچکا ہے... شی از بلڈی وچ!“

”تو طلاق دے دو۔“

اس نے میری جانب یوں دیکھا گویا میرا دماغ چل گیا ہو۔

”طلاق دے دوں؟“

”ہاں! جب اتنے تنگ ہو تو...“

”مگر میں تنگ تو نہیں۔“

”تو پھر.....“

”آئی کانٹ... تم یہ سب نہ سمجھ سکو گے، اس نے مجھ پر تعویذ کر رکھے ہیں، کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا، شی از اے وچ‘ میں خود بھی یہ

سب نہیں سمجھ پارہا... بٹ شی از اے... اے لو!“

میں نے نظریں اٹھائیں تو پروین آتی دکھائی دی، اس نے مسکراہٹ کا اظہار مارا، مجھے دیکھ کر خوشی سے چپکی۔ ”کیسے ہیں سلیم بھائی

آپ... مجھے اندازہ تھا کہ آپ یہیں ملیں گے۔“ پروین نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔

وہ ہمارے ساتھ بیٹھ گئی، میں مزید کافی آرڈر دینے لگا تو وہ خاور سے مخاطب ہوئی۔ ”جانی! میں نے سنور سے آج برازیل کی بڑی

شاندار کافی خریدی ہے کیوں نہ گھر چل کر پیئیں۔ آپ بھی چلے نا سلیم بھائی!“

”مجھے تو رہنے دیں۔“ میں نے گھڑی دیکھی۔ ”مجھے ایک ضروری کام ہے۔“

”تو پھر ہم چلیں خاور ڈیر!“

”ہاں چلو۔“

میں نے ان دونوں کو جاتے دیکھتا رہا۔ وہ خاور سے ایک یا شاید آدھ قدم آگے چلتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنے عزیز ترین دوست کو کافی کارز ہی سے نہیں بلکہ اپنی زندگی سے بھی نکلتا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا مجھے کوئی ضروری کام نہ تھا۔ لہذا بیٹھا رہا تازہ کافی منگوائی زہر مار کی مگر مزانہ آیا۔



نیاتماشا

”سنئے گا‘ جناب والا‘ یہ بندہ عاجز‘ ناچیز‘ کمترین‘ مجھے والا‘ آپ سائبان کی خدمت میں حاضر ہے۔ دوسرے شہر سے دوسری بستی سے دوسرے علاقے سے آیا ہوں۔ آپ سائبان کی خدمت میں نیا کھیل تیا تماشا اور نیا مجال لا یا ہوں۔“

”سائبان! مہربان! قدر دان! اسے جادو نہ سمجھئے کہ جادو جھوٹ ہوتا ہے صرف کھیل ہے یہ دل بہلانے کا تماشا‘ موج میلا ہے۔“
مجمع باز کے گرد آہستہ آہستہ لوگ جمع ہوتے جا رہے تھے۔ وہ دھول بھری سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ تنگ پیشانی‘ پتلا لبوتا چہرہ جسے نوکیلی ٹھوڑی نے تکیوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ تیز متحس آنکھوں میں سرمہ جو پسینہ سے تر چہرہ پر پھیلنے کو تھا۔ سیا چمکدار رنگ‘ پسینے میں بھیگنے سے تازہ پالش کئے بوٹ کی مانند لشکر رہا تھا۔

پھر کی کے مانند گھومتا وہ اپنے سامعین سے مخاطب تھا۔

”بچہ لوگ‘ پیچھے بیٹھ جاؤ! اور آپ بڑے سائبان ادھر آ جائے اور آپ مجمع باز کے گرد دائرہ آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا تھا۔“
”سائبان! مہر قدر دان! آپ نے بڑے بڑوں کے ہاتھ کی صفائی دیکھی ہوگی۔ شعبدے دیکھے ہوں گے۔ نظر بندی کے کمالات ملاحظہ کئے ہوں گے مگر یہ غریب مجھے باز آپ کے اس شہر میں آج ہی آیا ہے اور نیا تماشا لا یا ہے نیا مجال لا یا ہے۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتی۔

”آ جائیے آ جا۔“

ایک لڑکا جو لوگوں کے دائرہ کے کنارے لا تعلقی سے بیٹھا تھا اور جس کی طرف سے لوگوں نے توجہ نہ دی تھی اٹھ کر سامنے آ گیا۔
”یہ سب مائی باپ ہیں ان کو سلام بولو۔“

لڑکا چاروں جانب گھوم کر سب کو سلام کرتا ہے۔ مجمع باز لوگوں سے اس کا تعارف کراتا ہے۔

”سائبان! یہ میرا بچہ ہے۔“

”نہیں!“ لڑکا کڑک کر بولا۔ ”تو میرا بچہ ہے۔“

کچھ لوگ ہنستے ہیں۔ مجمع باز گویا بے چارگی سے سامعین کو دیکھتا ہے اور پھر پوچھتا ہے۔

”تم کون؟“

”بچہ جمورا۔“

”میں کون؟“

”جمورا۔“

مجمع میں تالی۔ وہ سوال کرتا ہے۔

”کنورے پہ کنورا۔“

جواب ملتا ہے۔ بیٹا باپ سے بھی گورا۔“

مجمع باز لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ ”ذرا اس گورے کی شکل تو دیکھو۔“ سب ہنستے ہیں۔ لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور مجمع لگتا جا رہا ہے۔ وہ بولے جا رہا تھا۔

”سانبان مہربان! قدردان! جیسا کہ میں نے بولا آج نیا تماشا دکھانے کو ہوں۔ ایسا تماشا جو آپ سانبان نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔“ وہ لڑکے سے مخاطب ہوا۔ ”چل بچہ جمورا... دھندا شروع کریں اللہ کا نام لے کر۔“

لڑکا خوشی سے ایک گندی اور پھٹی ہوئی دری بچھا کر اس پر چت لیٹ جاتا ہے۔ دائیں ٹخنے پر بائیں ٹخنہ رکھ کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیتا ہے اور پھر آنکھیں موند لیتا ہے۔ مجمع باز تین تلی سے چھڑیاں لڑکے کے سر پیٹ اور پاؤں پر رکھ دیتا ہے۔ مجمع خاموش ہے۔

”سانبان! مہربان! قدردان! آپ پوچھیں گے کہ یہ کیا ہیں تو مہربان! یہ چھڑیاں دکھ رہی ہیں چھڑیاں نہیں بلکہ وقت کے پر ہیں یہ.....“ وہ سر کی جانب رکھی چھڑی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”ماضی کے وقت کا پر ہے یہ۔“ وہ پیٹ پر رکھی چھڑی کے بارے میں بتاتا ہے۔ ”یہ حال کا پر ہے اور یہ۔“ پاؤں پر دھری ہوئی چھڑی کی جانب اشارہ کیا۔ ”مستقبل میں لے جانے والا پر ہے۔“

سب لوگ بڑی دلچسپی سے لڑکے کو دیکھ رہے تھے۔

”حضرات! سانبان! آپ دیکھیں گے کہ یہ بچہ جمورا آپ کے سامنے اڑے گا۔“

وہ توقف کر کے اپنی بات کے اثر کے لئے چہروں پر نگاہ دوڑاتا ہے۔ سب متاثر ہو چکے ہیں۔ یہ اندازہ کر کے وہ جوش کے ساتھ بولتے ہوئے لڑکے کو چادر سے ڈھانپ دیتا ہے۔

”سانبان! یہ جادو کا علم نہیں، دھوکہ نہیں فریب نہیں صرف آنکھ کا تماشا ہے اور وہ بھی آپ کی آنکھ کا، آپ غور سے دیکھیں گے“

اسے سمجھنے کی کوشش کریں گے، مگر کچھ سمجھ نہیں پائیں گے اس لئے کہ آپ وہ نہ دیکھیں گے جو آپ دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ آپ وہ دیکھیں گے جو میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں!“

سامعین اب دلچسپی کی گرفت میں تھے اور خاموشی سے میلی ساکت چادر کو ننگے جا رہے تھے جواب مجمع باز کے ہاتھوں کی پراسرار حرکات کے تحت آہستہ آہستہ اٹھتی جا رہی تھی وہ کہہ رہا تھا۔

”سائبان! یہ بڑا کڑا وقت ہے خاموش کھڑے رہئے۔ سگریٹ بجھا دیجئے اور دل میں سے ہر طرح کا خیال نکال دیجئے۔ صرف دیکھئے وہ دیکھئے جو میں چاہتا ہوں کہ آپ دیکھیں۔“

تب مجمع کی حیرت زدہ آنکھوں نے تین چھڑیوں پر یکساں طور پر اوپر اٹھتی چادر دیکھی۔ ایک دو مرتبہ یوں محسوس ہوا گویا اس کے اوپر اٹھنے کے عمل میں رکاوٹ آئی ہو۔ مجمع باز آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ گویا سرگوشی میں چادر کو ہدایات دے رہا ہو۔

”اور اوپر!“ چادر اٹھ جاتی ہے۔

”اور اوپر!“ چادر مزید اونچی ہو جاتی ہے۔

وہ گہرے انہماک سے چادر کو دیکھ رہا ہے گویا آنکھوں سے چادر اٹھا رہا ہے۔

”بس!“

مجمع باز کے جسم پر تناؤ ہے یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنی شکلی کے ذریعہ چادر اٹھا رہا ہو۔ سارا جسم پسینے میں بھیگ چکا ہے۔ ہاتھ ساکت ہو جاتے ہیں۔

”بس۔“ اس نے گویا حکم دیا۔ چادر ساکت ہو جاتی ہے۔ ماضی حال اور مستقبل کے پروں پر تنی چادر قبر سے مشابہہ ہے مجمع گویا طلسم زدہ ہو۔

مجمع باز تنی چادر اور پھر سامعین پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ اب جو بولا تو آواز میں پہلے ولا جوش واپس آ چکا تھا۔ ”سائبان! آپ یہ کہہ بچہ چور نے چادر تان رکھی ہے ایسا نہیں آپ میں سے جن صاحب کے دل میں شک ہو وہ خود آ کر دیکھ سکتے ہیں۔“

اس نے متوقع نظروں سے دیکھا مگر کوئی بھی آگے نہ بڑھا۔ بالآخر ایک معمر شخص سے مخاطب ہوا۔ ”آپ آئیے قبلہ آپ معزز انسان ہیں۔“

وہ شخص اچانک مرکز بگاہ بن جانے کی وجہ سے کچھ خفیف سا نظر آ رہا تھا۔ مجمع باز اسے چھڑی دے کر بولا۔ ”یہ چھڑی چادر کے

نیچے گھما کر اطمینان کر لیں مگر چادر نہ ہٹائیں۔

”کیوں بھی؟“ مجمع میں سے ایک آواز ابھری۔

”چادر بھید بھری ہے اس لئے۔“

معر شخص نے بیٹھ کر چادر کے نیچے چاروں طرف چھڑی گھمائی جو کسی رکاوٹ کے بغیر گھوم گئی۔

”اندر بچہ جمورا ہے۔“

مجمع باز کے سوال کے جواب میں معر شخص نفی میں سر ہلا کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا مجمع باز خوش ہو کر بولا۔

”سائبان! بچہ جمورا یہاں نہیں ہے۔“

”تو پھر کہاں ہے؟“ مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔

”ادھر، ادھر، اوپر۔“ مجمع دونوں بازو پھیلا کر بولا۔ ”آج بچہ جمورا کو سیر کرنے کی آزادی دی ہے جہاں چاہے جائے نہ گاڑی کی

ضرورت نہ ہوئی جہاز کی مگر یہ ان سے زیادہ تیز رفتاری سے سفر کرے گا کیونکہ.....“ وہ پراسرار انداز میں ایک انگلی کھڑی کر کے مجمع

پر نگاہ دوڑاتا ہے۔ ”کیونکہ“ وہ قبر نماتی چادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”کیونکہ یہ وقت کے پروں سے سفر کر رہا ہے۔“

مجمع تالیاں بجا کر داد دیتا ہے۔ ”اسے ٹکٹ اور سواری کی ضرورت نہیں۔“

اچانک وہ ساکت ہو جاتا ہے دائیں کان پر ہاتھ رکھ کر گہرے انہماک سے سننے کی کوشش کرتا ہے۔

”وہ ادھر ہے۔“ مجمع باز بتاتا ہے۔

چند لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر گویا فضا میں بچہ جمورا کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تب دونوں کے درمیان مکالمہ کا آغاز ہو جاتا

ہے۔

”میں کون؟“

”حائل۔“

”تم کون؟“

”معمول“

”گھوم جا“

”گھوم گیا“

”جو پوچھے گا بتلائے گا؟“

”بتلائے گا“

”سچ بتلائے گا؟“

”سچ بتلائے گا“

”جھوٹ تو نہ بولے گا؟“

”نہ بولے گا“

”میں کون؟“

”عالم“

”تم کون؟“

”معمول مگر....“

”مگر کیا؟“

”معمول کچھ چاہتا ہے۔“

”کیا چاہتا ہے؟“

”سیر کرنا، گھومنا“

”کدھر گھومنا؟“

”ہر طرف گھومنا.... اجازت؟“

”اجازت!“

”اب تم کدھر جائے گا؟“

”داتا صاحب کے دربار“

”داتا صاحب کے دربار پہنچ گیا؟“

”پہنچ گیا!“

”کیا دیکھا؟“

”لوگ دعا مانگتے“

”اور؟“

”عبادت کرتے“

”اور؟“

”قوال قوالی کرتے۔“

”اور؟“

”گنبد کے گرد کبوتر اڑتے“

(وقفہ)

”اب کدھر؟“

”اور جگہ آ پہنچا“

”کدھر؟“

”خوشحال خان خٹک کے علاقے میں“

”کیا دیکھا؟“

”مہمان کو گلے لگا رہے“

”اور؟“

”رقص کر رہے“

”رقص؟“

”ہاں وہ سب گردن کو جھٹکتے ہیں تو لمبے لمبے بال منہ پر آ جاتے ہیں۔“

”اور؟“

”کونلوں پر گوشت بھن رہا۔“

اور؟“

وہ خوشی سے بندوقیں چلا رہے۔“

اور؟“

”ان کے چہروں پر سورج اگ رہا۔“

(وقفہ)

”اب کدھر؟“

”روچی میں ہوں“

”کیا دیکھا؟“

”ریت سمندر میں ریت لہریں“

اور؟“

”خواجہ غلام فرید کا مزار“

اور کیا؟“

”مزار کے صحن میں لوگ اور کبوتر جمع ہیں“

اور کیا دیکھا؟“

”خواجہ فرید کی کافیاں پڑھ رہے ہیں“

اور؟“

”جذبات سے رو رہے ہیں“

اور بھی کچھ“

”ان کے بالوں میں سفر کی دھول کندہ ہو رہی ہے“

(وقفہ)

”اب کدھر کو؟“

”چل سرمست کے مزار پر ہوں“

”کیا دیکھا؟“

”لوگ ہی لوگ“

”کیا کرتے؟“

”درویش دھمال ڈال رہے“

”اور؟“

”گلے میں لال نیلے پیلے منکوں کی مالائیں اچھل رہی ہیں“

”اور؟“

”عقیدت کے نشے میں ہیں“

”اور؟“

”ان کی آنکھوں میں سورج اتر آیا ہے“

(وقفہ)

”اب کدھر پہنچا؟“

”سامنے نیلا سمندر“

”اور؟“

”پانی ہی پانی، لوگ ہی لوگ“

”اور کیا؟“

”لوگ سہمے ہوئے“

”کیوں؟“

”پتہ نہیں“

”اور کیا دیکھا؟“

”مائیں، بہنیں، بیویاں“

”کیا کرتیں؟“

”روتی، بین کرتیں“

”کیوں؟“

”پتہ نہیں“

”اور کیا دیکھ رہے ہو؟“

”بچے لوگ“

”کیا کرتا؟“

”خوف سے گھر میں میں ہے باہر کھیلنے کو نہ جاتا۔“

”کیوں؟“

”پتہ نہیں“

”اور کیا کیا؟“

”مرد لوگ“

”کیا کرتا؟“

”کچھ نہیں کرتا ڈر سے گھر میں چھپا بیٹھا“

”کیوں؟“

”پتہ نہیں“

”اور کیا؟“

”لوگ خوف سے بھاگے جا رہے“

”کدھر؟“

”پتہ نہیں“

”غور کرو“

”شاید کوئی بلا ہے“

”کیسی بلا؟“

”پتہ نہیں۔ بس بلا تو بلا ہوتی ہے۔“

”بلا کیا کرتی“

”لوگوں کی قربانی“

”کیوں؟“

”پتہ نہیں“

”بچہ جمورا“

”.....“

”بچہ جمورا“

”.....“

”بچہ جمورا“

”.....“

اچانک میلی چادر کی تنی قبر ڈھے جاتی ہے، تب مجمع حیرت زدہ آنکھیں چادر پر خون کے دھبے ابھرتے، نمایاں ہوتے اور پھیلتے دیکھتی ہیں۔



سیاہ حاشیہ

”کیا ایسا ممکن نہیں کہ مردے کو سفید کے بجائے کالے کفن میں دفن کیا جاسکے؟“ میں نے چائے کا کپ اٹھایا تھا مگر منہ تک لے جانے کے بجائے ہاتھ معلق رہ گیا، میری بیوی نے اپنی اس چیمٹی سہیلی کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور پھر جل کر بولی۔

”تم کالے کفن میں جہنم کا سفر شروع کرنا مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

وہ برامانے بغیر بولی۔ ”تم میرا مطلب نہیں سمجھی ہو میں تو.....“

مگر وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”میں تم جیسی فن کارہ کی گہری بات کا بھلا کیسے مطلب سمجھ سکتی ہوں۔“

اس نے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”میں تو ایک مفروضہ کے طور پر بات کر رہی تھی آخر کفن سفید ہی کیوں ہے؟“ میرا ہاتھ ابھی تک معلق تھا اسے نیچے کیا اور کپ میز پر رکھ دیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

”بھائی صاحب! آپ یہ سمو سے لیجئے نا!“

اس نے سموں کی پلیٹ میری جاب سرکادی، میں نے سمو سے کی جانب ہاتھ بڑھایا مگر بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا، وہ کہہ رہی تھی۔

”آخر کس قانون کے تحت کفن سفید لٹھے کا ہوتا ہے۔ عرب میں تو اس وقت لٹھا ہی نہ ہوگا۔“ اور پھر قدرے توقف کے بعد گویا ہوئی۔ ”آخر کالا کٹھا کیوں نہیں۔ سفید ہی کیوں؟“

میں نے وضاحت کی۔ ”کفن کسی بھی کپڑے یا رنگ کا ہو سکتا ہے، سفید تو صفائی یا پاکیزگی اور طہارت کی علامت کے طور پر ہے۔ دراصل یہ ایک تہذیبی رویہ ہے۔“

میری بیوی تنک کو بولی۔ ”آپ بھی کس پاگل کے ساتھ مغز ماری کر رہے ہیں۔“

مگر وہ اسے نظر انداز کر کے مجھ سے مخاطب رہی۔ ”شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں، پھر بھی میں سمجھتی ہوں کہ کالا کفن زیادہ موزوں ہے کیونکہ یہ موت، ماتم اور غم و اندوہ کا رنگ ہے۔“ اس نے چائے کا کپ منہ کو لگایا اور پھو بولی۔ ”آ کر موت کی خبر بھی تو سیاہ حاشیہ میں دیتے ہیں۔ ہیں نا۔“

”ہاں یہ تو ہے بلکہ ہماری زبان میں کالا رنگ برے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔“

”مثلاً؟“

میری بیوی بولی۔ ”یہ بربادی، نحوست، ویرانی اور جادو ٹوٹنے کا رنگ بھی تو ہے۔“ وہ بولی۔ ”ہاں۔ کالا بھوت، کالی ماتا، کالا ناگ، کالی بلی، کالا علم....“ لگتا تھا کالے رنگ کی بیت بازی شروع ہو گئی کیونکہ میری بیوی بولی۔ ”اور ہاں کالی آندھی، کالی زبان۔“

”کالی کوٹھڑی!“

”کالے کوس!“

”کالی آندھی!“

”کالا شاہ کا کو!“

وہ گفتگو جو سنجیدگی سے بڑھ کر ”ہوررموی“ کے مکالموں کی صورت اختیار کرتی جا جا رہی تھی، ہنسی میں تحلیل ہو گئی۔ میری بیوی نے مجھ سے کہا۔ ”آپ اس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہ لیں، یہ تو ہمیشہ سے ہی ایسی سنگی رہی ہے۔“

”اور اس کے باوجود بہت اچھی آرٹسٹ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اور اس کے باوجود یا پھر شاید اسی وجہ سے!“

”کون جانے...“ وہ پراسرار مسکراہٹ سے بولی۔ ”کون جانے!“

ناز، میری بیوی کی بہت ہی پیاری سہیلی تھی۔ دونوں نے کالج میں چار سال اکٹھے گزارے، بی اے کے بعد ناز نے فائن آرٹس کا رخ کیا اور طالب علمی کے دوران ہی ابھرتی مصورہ کے طور پر اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی۔

میں نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا، چائے بہت اچھی تھی، اس کے آرٹسٹک کمرہ اور اس میں سلیقہ سے سجی خوب صورت اشیاء کی مانند میں نے پوچھا۔

”یہ آپ نے کمرے کو وائٹ پیپر کیوں بنا رکھا ہے؟“

اس نے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ ”ایسے ہی.... بس ایسے ہی۔“

”اور اس کمرہ میں کوئی پینٹنگ بھی نہیں لگا رہی۔“

”ایسے ہی بس ایسے ہی!“

”پھر بھی ایک آرٹسٹ کا کمرہ اور پینٹنگ سے خالی کمال ہے۔“

”میری تصویریں اس قابل کہاں۔ اور اب تو خیر ویسے بھی کافی عرصہ سے کوئی تصویر نہیں بنا سکی۔“

”کیوں؟“

”ایسے ہی بس ایسے ہی!“

میری بیوی بولی۔ ”ایسے ہی تکلف فرما رہی ہیں صاحبہ! جس طرح بعض ڈاکٹروں اور حکیموں کے ہاتھوں میں شفا ہوتی ہے اسی طرح بعض ہاتھوں میں فنکاری ہوتی ہے۔“

”اچھا؟“ میں بناوٹی تعجب سے بولا۔ ”ذرا اپنا ہاتھ تو دکھاؤ۔“

اس نے مسکرا کر ہاتھ میرے سامنے کر دیئے۔ ”ہاں! بھی واقعی کمال کے ہاتھ ہیں۔ ان میں چار انگلیاں ہیں ایک انگوٹھا ہے اور بائیں ایک کلائی بھی تو ہے!“

سب نے قہقہہ لگایا پھر میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”آپ آرٹسٹ ہیں بلکہ بہت اچھی آرٹسٹ پھر یہ کالے رنگ کا کیا مسئلہ ہے؟“

میری بیوی بولی۔ ”اوہ! آپ نے پھر شروع کر دیں کالے کفن کی باتیں۔“

ناز سنجیدگی سے بولی۔ ”سلیم بھائی! میں آرٹسٹ ہوں اور ظاہر ہے کہ مجھے رنگوں سے بنیادی قسم کی دلچسپی ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ رنگ میرے آلات ہیں۔ کسی بھی سرجن، معمار یا کاریگر کے آلات کی مانند، لیکن اس کے ساتھ ایک اور بات بھی ہے جس کا عام لوگوں کو بالعموم اندازہ نہیں ہوتا۔ ہر جان دار پھل، پھول بلکہ پتھر تک کی اپنی اپنی شخصیت ہوتی ہے بالکل اسی طرح ہر رنگ کی بھی اپنی اپنی شخصیت ہوتی ہے شاید اسی لئے قدیم زمانے میں رنگوں کی سیاروں سے نسبت تھی جیسے جنگ کے سیارے مریخ کا رنگ سرخ تھا۔“

میری بیوی بولی۔ ”اے لو! کلر لیکچر شروع ہو گیا۔“

ناز اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”تم چپ رہو جاہل ایم اے اردو تمہیں کیا پتا رنگوں کا کیا جادو ہوتا ہے۔“ وہ اب عجب خوابناک لہجہ میں بول رہی تھی۔ ”تم نے دھنک نہیں دیکھی کیا؟ قطرہ شبنم میں رنگوں کے آنچل لہراتے نہیں دیکھے کیا؟“ اس نے میری بیوی کے بھڑکیلے لباس پر ایک نظر ڈالی اور پھر مسکرا کر بولی۔ ”عام لوگوں اور بالخصوص عورتوں میں جمالیاتی حس نہیں ہوتی، چیتنے دھاڑتے رنگوں والے کپڑے پہننے اور رنگ برنگے دوپٹے اوڑھنے سے بھلا کیا ہوتا ہے۔“ وہ اچانک خاموش ہو کر چائے کا گھونٹ بھرنے لگی۔ سفید لباس میں اس کے چہرے کا نمک چمک رہا تھا۔ بھرے بھرے ہونٹ جن پر بہت ہی ہلکے شیڈول والی لپ اسٹک

.... اسی لپ اسٹک جس کا رنگ ہونٹوں کی سرخی میں گھل مل جائے کتابی چہرہ ماتھے پر بالوں کی جھالزنا قابل یقین حد تک دراز پلکیں چہرہ کا مجموعی تاثر خوشگوار تو تھا مگر ساتھ ہی کوئی ایسی اضافی خوبی بھی تھی جو بیان میں نہ آ سکتی مگر اپنی جھلک بھی دکھاتی تھی۔ کوئی غیر مرئی سی چیز.... شاید آواز؟ جو بیشتر عورتوں کی طرح چپیں چپیں کرتی نہ تھی بلکہ صحیح معنوں میں ایسی آواز جسے سن کر مومن کے آواز والے اشعار کی صداقت کا یقین آ جائے۔ بالفاظ دیگر وہ خود بھی ایک جاذب نظر اور جاذب توجہ تصویر تھی۔

میں نے بات کا سلسلہ جوڑا۔ ”وہ رنگوں کی شخصیت والی کیا بات تھی؟“

”ہاں.....“ ہاں بولی۔ ”رنگوں کی شخصیت“ وی ایسے بول رہی تھی جیسے ان الفاظ کا ذائقہ محسوس کر رہی ہو۔ ”اس موضوع پر میں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔“ پھر اس نے ہنس کر میری بیوی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”مگر میں لمبا چوڑا لیکچر نہ دوں گی۔“

”نہیں! ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں۔“ اس نے چڑایا۔

وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”جس طرح ہر دو مخصوص تاثر رکھتی ہے اسی طرح رنگ بھی خاص تاثر رکھتے مثلاً سرخ گرم ہے۔ سبز ٹھنڈا ہے اور نیلا متعادل ہے ان رنگوں کی پسندیدگی یا ان کا مستقبل گویا اعصاب کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اسی لئے رنگوں سے علاج کا طریقہ ملتا ہے جو صدیوں پرانا ہے۔“

”گویا شعروں کے انتخاب کی مانند رنگوں کا انتخاب بھی دل معاملہ کھول سکتا ہے۔“ میری بیوی بھی گفتگو میں دلچسپی لے رہی تھی۔

”بالکل! اور یہ نفسیاتی لحاظ سے بالکل درست ہوگا۔“

میں نے پوچھا۔ ”مصور تو کھیل ہی رنگوں کا ہے تو ایسے میں.....“

وہ بولی۔ ”اگرچہ مصور تمام رنگ کا استعمال کرتا ہے مگر اس کے باوجود کوئی خاص رنگ اس کا پسندیدہ بھی ہوتا ہے جسے بالعموم استعمال کرتا ہے۔ ایسا رنگ جو اس کی تصویروں کے ساتھ ساتھ خود اس کی شخصیت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے جسے پکا سو کی ابتدائی دور کی تصویروں میں نیلا اور گلابی رنگ تو اتر سے استعمال ہوتا تھا اور.....“

وہ خاصی دیر تک پر جوش انداز میں گفتگو کرتی رہی۔ اٹھنے لگے تو میں نے پوچھا۔ ”اپ کا پسندیدہ رنگ کون سا ہے؟“

”کالا اور آپ؟“

”سانولا!“ میں نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔

واپسی پر ہم اسی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میری بیوی بتا رہی تھی۔ ”یہ بہت ذہن اور لگن سے کام کرنے والی تھی۔ اس

نے کالج اور یونیورسٹی میں تصاویر پر متعدد انعامات حاصل کیے اور لیکچرار بننے کے بعد مصوری جاری رکھی اور اب اسے اچھی خاصی شہرت حاصل ہے مگر....“

”مگر کیا؟“

”شادی کے بعد یہ کچھ الجھ سی گئی ہے۔“

”کیا مطلب ہے؟“

”کچھ عجیب سی بات ہے۔“

”کیوں؟ کیا خاوند سے نہیں بنتی؟“

”نہیں! یہ بات نہیں! ان میں تو بہت محبت ہے۔“

”محبت!۔۔۔۔۔ تو کیا لومیرج ہے؟“

”نہیں!“

”تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ ساس تنگ کرتی ہے؟“

”نہیں بلکہ اسے ساس ہی نے پسند کیا تھا۔ ساس اسے بیٹی کہتی ہے اور بہو نہیں بلکہ بیٹی ہی سمجھتی ہے۔“

”اچھا؟“

”واقعی وہ ان نایاب ساسوں میں سے ہے جو بہو کو سوت سمجھنے کے برعکس اس سے بیٹی جیسا پیار کرتی ہیں۔“

”اور یہ؟“

”یہ بھی ان کی بے حد عزت اور پیار کرتی ہے۔“

”میاں بیوی اور ساس خوش تو پھر تکلیف کیا ہے؟“

”عجیب سی بات ہے بلکہ خاصی بے معنی سی بات ہے اور سوچو تو سرے سے کوئی بات ہی نہیں۔“

”اوہو! اب بولو بھی....“

”یہ رنگ کا مسئلہ ہے۔“

”تو پھر کون سا رنگ ہے؟“

”کالارنگ!“

”یہ تم کیا پہیلیاں بچھا رہی ہو میں تو کچھ سمجھ نہیں سکا۔“

”ساس اسے کالارنگ استعمال نہیں کرنے دیتی۔“

”ساس اسے کالارنگ استعمال نہیں کرنے دیتی!“ میں نے دہرایا۔

”ہاں!“

”میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا اس کی ساس کو کالے رنگ پر کیوں اعتراض ہے؟ وہ اس رنگ سے الگ ہے؟“

”دراصل آپ کو ساری بات کا علم نہیں، ناز پر خاوند یا ساس کی طرف سے کسی طرح کی بھی پابندی عائد نہیں، صرف یہ کالے رنگ

کے کپڑے نہیں پہن سکتی۔“

”مگر کیوں؟“

”اس کی ساس کے بقول، کالاکپڑا پہننے کے لئے بہو کو ساس سے اجازت لیننی ہوتی ہے۔“

”تو یہ اجازت لے لے۔“

”نہیں ناں! ساس کو اس کی ساس نے اجازت نہیں دی تھی اس لئے وہ اسے اجازت نہیں دے سکتی۔“

میں زچ ہو کر بولا۔ ”یار! مجھے تو یہ سارا خاندان ہی ایسا رمل معلوم ہوتا ہے۔“

”نہیں کالے رنگ والی بات چھوڑ کر یہ ہر لحاظ سے نارمل لوگ ہیں۔“

”مگر یہ کیا بات ہوئی کہ کالاکپڑا پہننے کے لئے بہو ساس سے اجازت طلب کرے اور کیونکہ اس کی ساس کو اجازت نہ ملی اس لئے

بہو بھی کالارنگ استعمال نہیں کر سکتی۔ اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔“

”ضرور ہوگی۔“

”ناز سے پوچھا تھا۔“

”پوچھا تھا مگر وہ نال گئی۔“

”اب میں سمجھا کہ اس کا کمرہ مکمل طور پر سفید کیوں تھا۔“

”نہیں! یہ پابندی صرف سیاہ لباس تک ہے، تمام زندگی میں سیاہ رنگ پر بین نہیں!“

”اور تصویروں میں؟“

”تصویروں پر وہ کیسے پابندی لگا سکتی ہے۔ آخر بال سیاہ ہی پیٹ ہوں گے سفید تو نہیں ناں!“

”اس کے باوجود ناز کو الجھن تو ہوتی ہوگی۔ مصور تو ویسے ہی رنگوں کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔“

”الجھن جیسی الجھن ناز کے لئے کالا رنگ تو ایک کمپلیکس کی صورت اختیار کر چکا ہے۔“

”یہ تو ہونا ہی تھا شاید کبھی کالے کپڑے پہنتی لیکن پابندی کا احساس طلب میں شدت اور شدت میں لذت پیدا کر دیتا ہے۔“

”جیسی تو وہ سیاہ کفن کی باتیں کر رہی تھی۔“

میں ہنسا۔ ”سر پر سیاہ بال ہیں مگر اس رنگ کا لباس نہیں پہنا جاسکتا کہ ساس نے اجازت نہیں دی اور ہم اکیسویں صدی میں داخل

ہونے کی باتیں کر رہے ہیں۔“

بیوی بتا رہی تھی۔ ”ناز رنگ کے معاملے میں ذہنی طور پر اب اس قدر الجھ چکی ہے کہ اس نے تصویریں بنانی ہی چھوڑ دی ہیں۔“

”مگر کیوں؟ تصویروں کے رنگوں پر تو پابندی نہیں پھر کیوں؟“

”بس عجیب سی بات ہے کہتی ہے اب رنگوں کے ڈبہ میں سیاہ رنگ دیکھوں تو عجیب سی حالت ہو جاتی ہے۔ بقول اس کے شروع

شروع میں سیاہ رنگ میں برش ڈبو کر ویسا تھل محسوس ہوتا تھا جیسے ممنوعہ کام کرنے سے ہوتا ہے پھر یہ اس اعصابی تھرتھری میں

تبدیل ہو گیا جو برا کام کرنے سے محسوس ہوتی ہے مگر اب اس پر گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی ہے جیسے چوری پکڑے جانے پر خفت کا

احساس ہوتا ہے اور اس میں اتنی شدت پیدا ہو گئی کہ اب وہ سیاہ رنگ استعمال ہی نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر پینٹنگ؟“

”وہ چھوڑ دی۔“

”واقعی؟“

”ہاں! اس نے بتایا کہ میں سکی طرح سے بھی کالا رنگ استعمال نہیں کر سکتی۔“

”کمال ہے۔“

”کہتی ہے پینٹنگ میں بھی ہر شبیہ کو کالے کپڑے پہنانے کو جی چاہتا ہے۔“

یہ تو اچھا خاصا مینیا ہو گیا۔“

”بالکل!“

اس کے بعد بھی ہمارا ملنا جلنا رہا، کبھی وہ میاں بیوی آ جاتے، کبھی ہم چلے جاتے، اس کی ساس سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جو مہربان چہرے والی نرم خورت تھی۔ عام اور سیدھی سادی گھریلو خاتون جسے بیٹے اور بہو سے واقعی پیار تھا اور پھر مجھے ایک شرارت سوچھی، شرارت غالباً صحیح لفظ نہیں، تجربہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ ناز کے گھر پر چائے پر جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا۔ ”ایک کام کرو۔“

”کیا؟“

”کالا سوٹ پہن کر چلو۔“

”وہ کیوں؟“

”ناز کی ساس کا رد عمل دیکھنے کو۔“

اس کے چہرے پر شرارت کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”واہ! یہ مجھے کیوں نہ سوچھی۔“

”اس لئے کہ تم بنیادی طور پر ایک غیبی عورت ہو۔“

”اچھا! چلو زیادہ نہ اتر آؤ۔“

اس نے سیاہ سوٹ کے ساتھ چاندی کے زیورات پہنے۔ ”کیسی لگ رہی ہوں؟“

”بلیک اینڈ وائٹ!“

”ٹھہرو! اگر وہ ناراض ہو گئی تو۔۔۔۔۔۔؟“

”پہلی بات تو یہ کہ تم مہمان ہو اور دوسری بات یہ کہ وہ تمہاری ساس نہیں۔“

”درست!“

ناز منہ سے تو کچھ نہ بولی مگر بے ساختہ ہنسی اظہار مسرت کو کافی تھی۔ ساس کو اگر برا لگا تو اس نے اظہار نہ ہونے دیا۔ چائے بہت

خوشگوار موڈ میں بی گئی اور پھر اچانک ہی ساس بولی۔ ”بیٹی برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟“

”نہیں آنٹی!“

”بیٹی! یہ کالا رنگ نہ استعمال کیا کرو۔“

”کیوں آنٹی؟“ وہ چہرہ پر معصومیت بھرا تعجب لا کر بولی۔

”یہ بہت منحوس رنگ ہے۔“

وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”دراصل یہ اپنی پسند سے یہ سوٹ لائے تھے۔“

ناز کے چہرہ کا رنگ بدلتا جا رہا تھا مگر وہ خاموش تھی۔ ہم تینوں خاموشی سے ساس کی بات سن رہے تھے۔

”ہاں بیٹی! یہ بڑا ہی منحوس رنگ ہے، تم جو ان ہو اللہ اپنا فضل رکھے مگر یہ رنگ اچھا نہیں، اپنے جیسا بنا دیتا ہے انسان کو۔“ وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی جیسے بولنے یا خاموش رہنے کا فیصلہ کر رہی ہو پھر بولی۔ ”ہمارے خاندان کی بہو بیٹیوں کو کالا رنگ پہننے کی اجازت نہیں۔ نہ میں نے خود پہنا اور نہ ناز کو پہننے دیا۔“

”کوئی وجہ تو ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر تک خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔ ”تم سے کیا پردہ اپنے ہی بچے ہو۔ ہوا یہ کہ بہت پہلے ہمارے خاندان کی ایک لڑکی نے ایسی حرکت کی کہ خاندان کی ناک کٹوا دی۔ بوڑھوں اور بزرگوں نے رات کی تاریکی میں گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر ڈالا۔ وہ جن کپڑوں میں تھی ان ہی میں دفن کر دی گئی۔ اس وقت سیاہ لباس میں تھی تب سے ہمارے خاندان کی لڑکیاں کالا کپڑا نہیں پہن سکتیں۔“

”مگر صدیوں پرانی بات.....؟“

وہ میری بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔ ”ہر خاندان کی کچھ ایسی روایات ہوتی ہیں جنہیں توڑا نہیں جاسکتا۔“

”ہاں! یہ تو ہے۔“ ناز بولی۔

چند ماہ بعد ناز کا فون آیا۔ وہ رو رہی تھی اس کی ساس کا انتقال ہو گیا تھا۔

”مگر کیسے؟“

”کوٹھے کی سیڑھیاں اتر رہی تھیں کہ پاؤ پھسلا اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے آ گریں۔ بہت چوٹیں آئیں، بے ہوش ہو گئیں اور اسی بے

ہوشی میں انتقال کر گئیں۔“

”افسردہ ناز کی سوچی آنکھوں سے کثرت گریہ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ”وہ ساس نہیں بلکہ ماں کی طرح تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ بیٹی

ہی کی طرح سمجھا۔“ اس کی آواز میں آنسوؤں کی لرزش تھی۔

جنازہ، قل، چالیسواں اور پھر معمول کی مصروفیات!“

کارڈ آیا اور ساتھ ہی فون بھی۔ ناز کی تازہ تصاویر کی نمائش تھی۔ ہم کیسے نہ جاتے۔

ناز کی تصاویر اعصاب پر عجب اثرات ڈال رہی تھیں کہ یہ سب سیاہ تھیں۔ بلیک انک، چارکول، سیاہ مارکر، بلیک آئل پینٹ اور واٹر کلر۔ اس نے ہر صورت میں سیاہ رنگ استعمال کئے تھے۔ چمکیلے سفید کینوس اور آئیوری کارڈ بولڈ اسٹروکس سے عجیب ہانٹ کرنے والے نقوش ابھارے گئے تھے، لینڈسکیپ، منجمد سیاہ لاوا، پھول سیاہ، کیلکٹس، شاخیں کالے ناگ، بچے کالے پتھر، عورتیں کالی چٹانیں، دریا پگھلا ہوا کونکہ ہاتھ درختوں کی سیاہ جڑیں، سیاہ چہروں پر وحشت سے پھٹی آنکھیں، دہشت سے کھلی آنکھیں، حیرت سے ابلی آنکھیں، چیختے ہونٹ، پھنکارتے ہونٹ، دھتکارتے ہونٹ، بھنور میں ڈوبتی ہوئی عورت کا مدد کے لئے اٹھا ہوا ہاتھ، کوؤں کے زرخے میں عورت، ہاتھ اور پاؤں پر بھاگتی عورت۔

عجیب تصاویر تھیں اور عجب تاثرات!

دیکھنے والے چپ چاپ یوں ان تصاویر کے سامنے سے گزر رہے تھے گویا میت کا آخری دیدار کر رہے ہوں۔ ناز نہ جانے کہاں تھی، سوہم بھی ناز کے طلسم خانہ میں خود کو گم پارہے تھے۔ ایک تصویر پر ہم ٹھٹھک کر رک گئے۔ کوٹھے کی سیڑھیوں سے سر کے بل گرتی عورت اور پس منظر میں پھیلے ہاتھ سے مشابہ سیاہ بادل۔ ہم دونوں تصویر دیکھ کر کچھ اور بھی قریب ہو گئے، ہم نے دوبارہ تصویر کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو!

”اوہ! تم یہاں ہو!“

اس کی آواز سن کر ہم پلٹے۔ سیاہ لباس میں ملبوس ناز اپنی نمائش ہی کی ایک تصویر معلوم ہو رہی تھی۔



آخری تدبیر

آئینہ جب بے رونق صورت دکھا رہا تھا۔ اندر کو دھنسی آنکھیں ان دیوان گھونسلوں جیسی تھیں جن سے نظر کی چڑیاں پرواز کرنے کی ہو۔ پیشانی کی گہری لکیریں بے آرام بستر کی میلی شکنوں کا منظر پیش کر رہی تھیں، مونچھوں کے سر بلند کنارے، شکست خوردہ پرچم کی مانند سرنگوں تھے، منہ پر ہاتھ پھیرا تو بڑھی شیو کے کھر درے بالوں کی نوکیں پنوں کی مانند چھیں۔ دھندلائی نظروں سے آئینہ کو ٹکا کیا حتیٰ کہ جسم نے پھریری لی، گلا جیسے رندھ رہا ہو، آنکھوں کے گدلے شیشے نمی سے ملگے ہونے کو ہوں، شاید بازو میں ریشہ بھی محسوس ہو رہا تھا یا پھر کچھ بھی نہیں تھا، سب وہم تھا اور دل کی دھڑکن کا مدوجز محض وسوسہ تھا۔

تب آئینہ مخاطب ہوا۔

”پریشان ہو؟“

”نہیں تو!“

”پشیمان ہو؟“

”نہیں تو!“

”پھر یہ منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟“

”مجھے کچھ نہیں معلوم، جو دکھا رہے ہو وہی دیکھ رہا ہوں۔“

”تو کیا میں غلط دکھا رہا ہوں؟“

”نہیں تو!“ ”تم خوش تو ہونا؟“

”یقیناً۔“

”سوچ لو۔“

”سوچنے کی کیا بات ہے، میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے، خوشی خوشی، اپنی بیوی کے لئے کیا ہے۔“

”بیوی کے لئے؟“ آئینہ نے بیوی کی ”ی“ کو عجب لہجہ میں کھینچا۔ تحقیر، تمسخر، طنز، استہزاء؟

”تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟“

”یہ تاب‘ یہ مجال‘ یہ طاقت نہیں مجھے۔“

”پھر طعنے کیوں دے رہے ہو؟“

”طعنے تو نہیں‘ صرف سوال کر رہا ہوں۔“

”سوال؟“

”کیا تم خود سے سوال کرنے کی جرات رکھتے ہو؟“

”اچھا بک بک مت کرو۔ وہ بے چاری جاگ جائے گی۔“

”بے چاری جاگ جائے گی۔ ہا ہا ہا ہا“

اس نے بے زار ہو کر آئینہ سے منہ موڑا تو بستر پر نظر پڑی، بیوی نیند کے گہرے پانیوں میں اتری ہوئی تھی، نقاہت کے باوجود چہرہ پر اب عجب سی رونق دکھائی دے رہی تھی۔ چہرہ پر کھنڈی وہ زردی جو پہلے موت کی کہانی کی تمہید دکھائی دیتی تھی اب صحت کے عنوان میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ماتھے اور نیچے پر بکھرے بال مریض چہرے کی تصویر کو حاشیہ کئے ہوئے تھے۔ بھرے بھرے لب اس وقت ماند اور سیاہ سیاہ سے تھے، مگر جانتا تھا کہ جلد ہی صحت مند خون انہیں سرخ کر کے سنگترے کی پھانک کا رس بھر دے گا۔ بھاری پوٹیوں میں ملفوف آنکھوں سے مرض کی چلمن سر کی تو یہ شربت کے کٹوروں میں تبدیل ہو جائیں گی۔

وہ دیر تک کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر احتیاط سے بستر کے سرہانے بیٹھ کر پیار سے اس کے بکھرے بالوں کو سمیٹتا مگر اس احتیاط سے کہ چھو جانے سے نیند خراب نہ ہو جائے۔ اسے بہتر دیکھ کر فخر و انبساط کی لہروں نے اعصاب میں سرشاری کی کپکپی پیدا کر دی۔ بیوی کی محبت میں اس نے وہ کردکھایا تھا جو کسی بھی شوہر کے بس کا نہ تھا جسے وہ اپنی جان اور جان سے پیاری کہا کرتا تھا، اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ واقعی جان سے پیاری ہے.... و فور جذبات سے آنکھیں بھیگ گئیں!

نہ تو اس کا باپ فرغانہ حکمران مرزا عمر شیخ تھا اور نہ ہی ماں کا نام قتلوغ نگار خانم تھا مگر اس کے باوجود دونوں نے بیٹے کا نام ظہیر الدین بابر رکھا، محض اس لئے کہ باپ تاریخ کا استاد تھا اور اسے تمام تاریخی شخصیات میں سے بابر کی شخصیت اور کردار بے حد پسند تھا۔ اگر بادشاہوں کے نام پر ہی بیٹے کا نام رکھنا مقصود تھا تو ناموں کی کمی نہ تھی۔ شہنشاہ اکبر اعظم، جہانگیر اور پھر شاہجہاں مگر اس کا ہیر تو بابر ہی تھا لہذا اس کے نام سے ہی اپنی پیڑھی کا آغاز کیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ استاد کا بیٹا نہ کسی سلطنت کی بنیاد رکھے گا نہ محل، باغ اور

باغیچے بنوائے گا، حتیٰ کہ ثواب دارین حاصل کرنے کے لئے کوئی مسجد بھی کھڑی نہیں کر سکتا۔

اگر معلم تاریخ نے یہ سوچا کہ نام کے اثرات کے باعث بیٹا، بابر ہی کی مانند جلال و جمال کا امتزاج ثابت ہوگا اور اولوالعزى، عالی ظرفی اور بلند ہمتی جیسے بابر کی اوصاف سے شخصیت جگمگا اٹھے گی تو اندازہ غلط ثابت ہوا اور تو قعات پوری نہ ہوئیں۔ یعنی نام نہند برعکس والی بات درست ثابت ہوئی کہ شاہانہ اوصاف کے برعکس عجب کمینہ طبیعت کا نکلا اور اس کی پیدا کردہ جملہ خامیوں نے کم ظرفی اور بالخصوص کنجوسی کی صورت میں اظہار پایا۔ پیسہ خرچ نہ تو کجا کلمہ خیر بھی منہ پورے میں بند رکھتا۔ جس صبح فلش کر دیتا سارا دن خود کو فضول خرچ محسوس کرتا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ اطوار میں پختگی آتی گئی جو پہلے عادات اور پھر فطرت ثانیہ میں تبدیل ہو گئے۔ ویسے بقول والدہ محترمہ وہ دل کا برانہ تھا۔ شاید یہ صحیح ہو کیونکہ جب اس کا دل شمینہ پر آیا تو اس کی کایا کلمپ ہو گئی یوں کہ وہ کسی لحاظ سے بھی برانہ رہا۔ اس نے شمینہ کو ایک شادی میں دیکھا۔ نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس جھلمل کرتی شمینہ دل میں سا گئی، وہ اسے ہی دیکھتا رہا۔ دوپٹہ گرانے کا انداز اور دوپٹہ اٹھانے کا اسلوب، چلتے چلتے گردن موڑ کر یوں ہنسا کہ گالوں میں گڑھے پڑ جائیں۔ بالوں کی لٹ سیاہ ہلال اور چہرہ کا بدر۔ الغرض وہ سالم کی سالم سا گئی دل میں“

ظہیر الدین بابر پہلی مرتبہ محبت کی برکھا میں یوں بھیگا کہ دل کی شور زدہ زمین میں محبت کا گلاب مہک دینے لگا اور یہی گلاب اس نے شمینہ کے جوڑے میں سجایا۔

یہ عجب اتفاق یا پھر حسن اتفاق تھا کہ شمینہ بابر کے برعکس کھلی ڈلی، کھلے دل اور کھلے ہاتھ کی، بے تکلفی سے قہقہہ لگانے والی جس کا دل زبان اور عمل ایک، شمینہ کی محبت اور اس کے جسم کی گرم جوشی نے بابر کی فطرت پر جمی برف جب پگھلا دیا تو اندر سے ایک خوبصورت بابر برآمد ہوا۔ شاید اسے ان ہی چیزوں کی ضرورت تھی اور ان کے فقدان کے باعث شخصیت زنگ آلود ہو چکی تھی اور اب شمینہ اسے صیقل کر رہی تھی اور جب زنگ کرخت چھلکا اتر گیا تو ظہیر الدین بابر کی شخصیت کا کندن نکل آیا۔ اب وہ نکسال سے نکلا لاش لاش کرتا، نیا کورسک تھا۔ ایسا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ عورت، مرد کو کیسے برباد کرتی ہے اس کی مثال بیوی پیش کرتی ہے اور عورت، مرد کو کیسے آباد کرتی ہے اس کی بھی مثال بیوی ہی پیش کرتی ہے۔ شمینہ نے یہ پرانی بات سچ کر دکھائی۔

ظہیر الدین بابر خوش تھا، بے حد خوش، گویا ان نے اپنی مغل سلطنت کی بنیاد استوار کر لی ہو، اس امر کے باوجود کہ شمینہ ولی عہد دینے کی اہل نہ تھی۔ ماہم بیگم کی مانند! شمینہ کو آئینہ میں دیکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی ہے، لپ اسٹک لگا رہی ہے، کانوں سے بندے اتار رہی ہے، بیڈروم کی دیوار کے نیلے رنگ کے پس منظر میں آئینہ کے فریم کا سنہری رنگ خوب ابھرتا تھا

اور اسی بیضوی فریم میں وہ شمینہ کے چہرے کا حصہ بازو کی جھلک ہاتھ کا گلوز اپ دیکھتا رہتا اسے شمینہ کو مکمل دیکھنے کے مقابلے میں یوں قسطوں میں دیکھنا زیادہ پسند تھا۔ تھوڑی تھوڑی جرمہ جرمہ!

وہ بستر پر لیٹا نہ دیکھنے کے انداز میں آئینہ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بال سنوار رہی تھی ان بالوں کو سلجھا رہی تھی جنہیں رات باہر نے بڑی مشکل سے الجھایا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی کھوئی سی تھی دماغ کہیں اور مگر ہاتھ میکا کی انداز میں برش چلائے جا رہا تھا پھر وہ خود بخود دیوں شرمائی جیسے کسی شرم دلانے والی بات نے چنگلی لی ہو وہ محسوس اسے دیکھا کیا۔

اس آئینہ میں ان دونوں نے خود کو پہلی مرتبہ یکجا دیکھا تھا۔

”دیکھو۔“ وہ اس بچے جیسے پر جوش لہجہ میں بولا جو پہلی مرتبہ قتل دیکھ رہا ہو۔

”ہٹو بھی! بے شرم کہیں کے!“

اور اب اسی بیڈروم کی نیلی دیوار پر آویزاں سنہری فریم والا بیضوی آئینہ مریمہ کی نقابہ بھری ساکت تصویر دکھا رہا تھا۔ ایسی ساکت تصویر کہ ناتوانی کی تصویر محسوس ہو۔

شمینہ جب بیمار ہوئی تو کسی نے بھی بطور خاص تشویش کا اظہار نہ کیا چنانچہ عورتوں کی عام بیماری سمجھ کر محلہ کی لیڈی ڈاکٹر سے دوا لے لی گئی مگر جلد ہی مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی جیسا عالم ہوتا گیا۔ زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ مرض کی تشخیص نہیں ہو رہی تھی جس کے نتیجے میں پہلے طرح طرح کے ٹیسٹ اور اسپیشلسٹ پھر حکیم اور ہومیو پیتھک اور اب آخر میں مزاروں پر منتیں اور پیروں کے تعویذ مگر سب بے سود شمینہ نامعلوم مرض کی دلدل میں دھنستی ہی گئی۔

ظہیر الدین بابر کی زندگی اب تک امن اور سکون کا گہوارہ تھی مگر اب پہلی مرتبہ اسے زندگی کی بنیادوں میں زلزلہ محسوس ہو رہا تھا۔ زندگی کی مرکز و محور بیوی موت کا لقمہ بننے کو تھی یہ اب تلخ مگر اٹل حقیقت تھی اور بابر کے لئے بذات خود یہ تصور موت سے کم نہ تھا۔

آئینہ جس بیمار کا چہرہ دکھاتا وہ بھی مریمہ ہی معلوم ہوتا۔

ایک رات شمینہ کی آنکھ کھلی تو بابر پٹی سے لگا دکھائی دیا۔ چہرہ بیوی کا عکس بنا اور آنکھیں نیند سے بوجھل۔ خاوند کی محبت پر اس کا دل ابھر آیا۔ اسے بھی اب اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا۔ پہلے تو موت کا تصور سوہان روح تھا رات کے پچھلے پہر کی خاموشی میں وہ موت کے سرد ہاتھ کو اپنی جانب بڑھتا محسوس کرتی تو لرز لرز جاتی مگر اب نہیں۔ اب اس نے یقینی موت سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اسی عالم یاس میں خدمت کرنے والے خاوند کی محبت ہی اس کا سب سے بڑا سہارا تھی بلکہ وہ تو یہ بھی سمجھتی تھی کہ اب تک وہ زندہ ہے تو صرف

خاوند کی لگن کی وجہ سے ہے۔

اس نے بابر کے ہاتھ پر اپنا سوکھا ہاتھ رکھ دیا۔

”آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟“

وہ خاموش اسے دیکھتا رہا۔ بولنا چاہا مگر ہونٹوں کے کنارے کپکپا کر رہ گئے۔ ”موالی سب ٹھیک کر دے گا۔“

اس نے کہنا چاہا۔ ”نہیں! اب کچھ بھی ٹھیک نہ ہوگا۔“ مگر خاموش رہا البتہ چہرہ کی زرد تکان سب کچھ کہہ رہی تھی۔

ثمینہ کا مرجھایا ہوا ہاتھ اس کے اعصاب میں عجیب طرح کی کپکپی پیدا کر رہا تھا۔ صابر کو اس ہاتھ کی انگلیوں کے نیچے پڑنے والے گڑھوں کا گداز یاد آ رہا تھا۔ تب ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ بچوں کی مانند ہلکے ہلکے کر رہا تھا۔ بستر پر ثمینہ کے سر کے قریب سر رکھ سکیوں سے سارا جسم ہل رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ گزشتہ ایام کی تھکن، کلفت، تناؤ، دکھ اور پریشانی سب کا مظہر یہ آنسو تھے۔ وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ رونا چاہتی تھی مگر نقاہت نے جسم سے شادابی کے ساتھ آنسو بھی چوس لئے تھے۔

پھر وہ آہستہ آہستہ سکون پذیر ہوتا گیا۔ پلنگ پر سے سر اٹھایا تو سامنے آئینہ میں آنسوؤں سے بھیگا اپنا چہرہ دکھائی دیا۔ اور تب اندھیری رات میں بجلی کا کوند اچک کر لحظہ بھر کے لئے جس طرح تاریک منظر اجاگر کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح پریشان ذہن میں آخری تدبیر نے لشکارا مارا۔

بابر نے آئینے سے نظریں ہٹا کر مریضہ کو دیکھا جو پریشان نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ کچھ دیر تک بابر کی نظریں ثمینہ کے چہرے کا جائزہ لیتی رہیں، دونوں نظریں ملیں۔ ثمینہ بابر کے چہرے کے تغیر سے پریشان ہو رہی تھی۔ وہ جو مدت سے مسکرایا نہ تھا۔ کھل کر ہنس رہا تھا۔

”تم اب ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

وہ اسے بے اعتمادی کی خاموشی سے دیکھتی رہی۔

”ہاں ہاں!“ وہ گنگناتے لہجہ میں بولا۔ ”تم قطعی طور پر تندرست ہو جاؤ گی۔“ ثمینہ نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر وہ بے صبری سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”مایوسی کی باتیں کر کے میرا شکون نہ خراب کر دینا۔“

”شکون؟“

”ہاں ہاں ابھی ابھی انسپریشن ہوا ہے.... سنو!“

کہیں یہ پاگل تو نہیں ہو گیا، ثمنینہ نے دکھ سے سوچا، میری مسلسل بیماری اور تیمارداری کی مسلسل پریشانی اور اب مایوسی سے یقیناً اس کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ اسے دکھ، رحم اور محبت بھری نظروں سے دیکھے جارہی تھی۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں، یقیناً یہ پاگل ہو گیا ہے۔

وہ انگلی کھڑی کر کے بولا۔ ”تم اسے راز ہی رکھنا۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”گھر میں کسی کو ہوا بھی نہ لگے نہ اماں کو نہ ابا کو اور نہ تمہارے کسی رشتہ ار کو۔“ وہ عجب لہجہ میں بول رہا تھا۔ ”یہ ہمارا تمہارا راز ہے، میاں بیوی کا۔“ اور ایک مرتبہ پھر ہنسا، عجب سی ہنسی شاید وحشت بھری ہنسی۔

”تم پاگل ہو گئے ہو“ وہ بالاخر بولی۔

”ہا ہا ہا ہا!“ وہ جواب میں ہنس دیا۔ وہ متوحش ہو کر دیکھ رہی تھی۔ ”خدا کے لئے سوچو تو.... کیا کہہ رہے ہو؟“

”ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔“ وہ خوشی سے چٹکی بجا کر بولا۔

”ابھی سمجھ میں آ جائے گا۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے بولا۔

وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر ایک دم اٹھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

”وضو کرنے۔“

”ہائے اللہ!“

تب ظہیر الدین بابر نے بڑے اہتمام سے وضو کیا اور دو نفل پڑھے۔ وہ دیر تک ہاتھ اٹھائے دعا مانگتا رہا۔ ثمنینہ اسے متوحش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جاء نماز سے اٹھا اور ثمنینہ پر دعا کی پھونک ماری۔ پھر وہ اس کے سرہانے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا۔ ایسی بلند آواز کہ ثمنینہ نے محسوس کیا، سارا شہر جاگ جائے گا۔

”اے خدا! میں اپنی بیوی ثمنینہ کی بیماری اپنے سر لیتا ہوں۔“

ثمنینہ رو رہی تھی!

مگر وہ اس کے آنسوؤں سے لاطعلق، مریضہ کے پٹنگ کے گرد چکر لگا رہا تھا، اس کی چال میں مستانگی کی عجب لڑکھٹاہٹ تھی، کسی غیر مرئی نقطہ پر مرکوز اس کی آنکھیں اندرونی روشنی سے دمک رہی تھیں، گردن فخر سے تنی، وفور شوق سے جسم میں لرزش، مگر پاؤں میں

استقامت! وہ ہر چکر کے بعد با آواز بلند پکارتا۔

”اے خدا! میں اپنی بیوی شمینہ کی بیماری اپنے سر لیتا ہوں۔“

ظہیر الدین بابر کو لگا جیسے کمرہ ان دیکھے وجود سے بھر گیا ہے شاید وہ فرشتے تھے جن کے مقدس پروں کی پھڑپھڑاہٹ ”آمین! آمین!“ کہہ رہی تھی۔ فضا میں کسی عجیب اور نامانوس موسیقی کی لہروں کو جسمانی طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ موسیقی کے سروں کے ساتھ کچھ سرگوشیاں بھی سنائی دے رہی تھیں، تعجب اور مسرت کی.... شاید ظہیر الدین بابر بادشاہ اس کا بیٹیا ہمایوں اور مغل امرہ اور وزراء کی روحمیں اسے برکت دینے کو آئی تھیں۔ درود یوار ”آمین آمین“ پکار رہے تھے جسم کا رواں رواں پکار رہا تھا۔ ”آمین! آمین!“

نیلی دیوار پر سنہری بیضوی فریم والا آئینہ عالم حیرت میں گم!

”اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!“ موذن کی اذان گونجی۔

”دیکھا!“ وہ پر جوش لہجہ میں بولا۔ ”خدا نے میری التجا سن لی۔“

شمینہ روئے جاری تھی مگر اسے وہ آنسو گویا دکھائی نہ دے رہے تھے وہ اسی پر جوش لہجہ میں بولا۔ ”تم اب ٹھیک ہو جاؤ گی میری التجا قبول ہو چکی ہے۔“

”اور تم؟ وہ بہ دقت بولی۔

”میں؟“ وہ ہنسا۔ ”میرا کیا ہے۔“ پھر وہ ہنسا۔ ”بھلا میرا کیا ہے؟“

اور واقعی معجزہ رونما ہو گیا، شمینہ بتدریج ٹھیک ہوتی جا رہی تھی، سب اسے نئے اینٹی بائیوٹک کپسول کا کرشمہ قرار دے رہے تھے مگر اصل سبب میاں بیوی ہی کو معلوم تھا۔ بیوی کی صحت کے تناسب سے خاوند کمزور ہوتا جا رہا تھا پر وہ خوش تھا کہ خدا نے اس کی جان کا نذرانہ قبول کر لیا تھا۔ کئی صدیوں بعد اس نے عظیم مغل تاجدار کے نام کی لاج رکھ لی تھی، وہ محض نام ہی کا نہیں بلکہ عمل کا بھی بابر ثابت ہو گیا تھا۔ پھر بابر نے تو ولی عہد کو بچایا تھا کہ مغل سلطنت داؤد پر لگی تھی مگر اس نے تو اپنی محبت کو حیات نوودی تھی۔ یہ کام تو شاہ جہاں بھی نہ کر سکا تھا۔ شاہی خزانہ ہو تو تاج محل بنوانا آسان کام ہے مگر جان کے بدلے جان کا سودا کسی عاشق، محبوب اور شوہر نے کیا تھا۔ اس احساس کے پیدا کردہ فخر سے سینہ تن جاتا۔

”دیکھا میں نہ کہتا تھا؟“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ”تمہارے ہاتھ اب نرم ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ اس کی انگلیاں سہلا کر بولا۔ ”میں نہ کہتا تھا.....؟“ اس کے ہاتھ پر آنسو کے قطرے گرے۔

”پگلی۔“ وہ شمیمہ کے گال پر پیار سے چپت مار کر بولا۔

عین اس وقت آئینہ سے آنکھیں چار ہوئیں۔ اس نے پہلی مرتبہ غور سے اپنا پڑا مردہ چہرہ دیکھا۔ تب آئینہ مخاطب ہوا۔ ”پریشان ہو؟“

”نہیں تو۔“

”پشیمان ہو؟“

”نہیں تو۔“

”پھر یہ منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟“

اسے یقین تھا کہ وہ جاگ رہا ہے، کمرہ میں بلا دستک ایک انسانی پنجرہ داخل ہو گیا اور بے معنی اچھل کر د شروع کر دی۔ ایک اور اور پھر ایک اور..... وہ ان کی ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ صاف سن سکتا تھا، پھر ان کھڑکھڑاتے ڈھانچوں نے پنگ پانگ کھیلنی شروع کر دی۔ وہ ان کا کھیل بڑے غور سے دیکھتا رہا، تب اسے اندازہ ہوا، انسانی کھوپڑی گیند بنی ہے اور تب انکشاف ہوا کہ یہ تو اسی کی کھوپڑی تھی۔ کمرہ کا فور کی خنک بو سے بھرا بھرا تھا۔ اس نے گھبرا کر شمیمہ کی جانب دیکھا۔ وہ سکون کی نیند سو رہی تھی، سانس ہموار اور خزاں زدہ چہرہ پر آنے والی بہار کی آمد کے آٹا ہویدا تھے۔ پھر اس کی نظریں آئینہ کی جانب اٹھ گئیں مگر وہ بھی غالباً آنکھ بند کئے محو خواب تھا۔ باہر نے کلمہ کا ورد شروع کر دیا تاہم رات بھر نیند نہ آئی!

جنازہ تیار تھا۔ سفید کفن میں لمبی لغش کے گرد والدین، عزیز واقارب اور احباب رو رہے تھے۔ پھر فضا میں آواز گونجتی ہے۔ “کلمہ شہادت!“

جنازہ اٹھایا جا رہا ہے۔ گھر میں کہرام برپا ہے۔ اس کے چہرے پر سے کفن سر کا یا جاتا ہے۔ تیز دھوپ آنکھوں میں کھب جاتی ہے۔ ساتھ ہی فل میک اپ اور سرخ جوڑے میں ملبوس شمیمہ اس پر جھکتی ہے اس کی مسکراتی آنکھیں اسے عجب دلربا انداز سے دیکھ رہی ہیں۔

”گڈ بائی مائی ڈارلنگ وہ اٹھلا کر کہتی ہے، وہ ہنستی ہے۔“ یوسینی منیئل فول، وہ کفن کا سراپوں بے پروائی سے چھوڑتی ہے گویا صندوق کا ڈھکن بند کر رہی ہو۔ چیخ مار کر بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کی دانست میں چیخ سارا شہر بیدار کر سکتی تھی مگر شمیمہ کی نیند کے گہرے پانیوں پر بیداری کی ذرا سی بھی لہر رونما نہیں ہوتی۔ وہ بے ترتیب سانس درست کرتا ہے۔ ہاتھ سے پسینے کے قطرے پونچھتا ہے، پانی پینے کو اٹھا تو سامنے آئینہ تھا۔ ”مجھے کچھ نہیں معلوم، جو دکھا رہے ہو وہی دیکھ رہا ہوں۔“

”تو کیا میں غلط دیکھا رہا ہوں؟“

”نہیں تو۔“

”تم خوش تو ہونا۔“

”یقیناً!“

”سوچ لو!“

”سوچنے کی کیا بات ہے میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے خوشی خوشی اپنی بیوی کے لئے کیا ہے۔“

”بیوی کے لئے؟“ آئینہ نے بیوی کی ”ی“ کو عجب لہجہ میں کھینچا۔ تحقیر، تمسخر، طنز، استہزاء!

شمینہ کی بیماری سے پریشان گھروالوں کے لئے اس کی بیماری مزید پریشانی کا باعث بن رہی تھی اس کی ماں کو اب پختہ یقین ہو چکا تھا کہ کسی بدخواہ نے ان کے گھر پر تعویذ کر دیئے ہیں۔

نائٹ میسرز کا سلسلہ جاری رہا، تقریباً ہر خواب میں قبرستان، قبریں اور اپنا مردہ دیکھتا، کار خیر کے باوجود خود کو قبر کے عذاب میں مبتلا دیکھتا۔ پچھوڑ تک مارتے، کن کھجورے جسم پر سرسراتے، بڑے بڑے بازوؤں والی چگاڑیں خون پیتیں اور الودیدے نوچتے۔ عظیم قربانی کا یہ اجر؟ اپنی خاموش چیخوں سے اس کی روح تک پر لرزہ طاری ہو جاتا!

اس رات اسے نیند نہ آ رہی تھی۔ تمام رات دیوار کے ساتھ تکیہ لگائے نیم دراز گزرتی رات کی چاب سننا رہا۔ شمینہ صحت کی نیند سو رہی تھی اور وہ خود۔۔۔۔۔؟

کھلی کھڑکی سے اپریل کے پھولوں کی مہک اندر آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی میں جا کر کھڑا ہوا۔ لمبی سانس پھینچڑوں میں مہک بھری ہوا کی جھولی انڈیل لی۔ خنک چاندنی اسے پرسکون کر رہی تھی۔ کھڑکی میں دونوں بازو پھیلائے وہ خوابیدہ شہر اور بیدار آسمان کو تکتا رہا۔ وہ خود کو عجب عالم میں محسوس کر رہا تھا۔ تب چاندنی گویا بجلی کے کوندے میں تبدیل ہو گئی۔ اندھیری رات میں لمحہ بھر کے لئے اجاگر ہونے والے منظر کی مانند ان دونوں کے امراض کے خاتمہ کے لئے آخری تدبیر آشکار ہو گئی۔

بیوی کے ساکت جسم سے تکیہ اٹھا کر ہٹا تو آئینہ سے سامنا ہو گیا۔

”تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟“

”یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے!“



چھوٹی اینٹ

”یہ....!“

خلیفہ نے اسے یوں دیکھا گویا ہاتھی، مینڈک کو حیرت سے دیکھے کہ مخلوق کی کوئی قسم اتن چھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے چندھی آنکھوں کو پورا کھول کر دو بارہ غور سے دیکھا کہ شاید وہ یوں ہی کچھ بڑا دکھائی دے جائے مگر نہیں، وہ اپنے قد بہت میں اتنا ہی رہا جتنا کہ وہ تھا۔ ادھر وہ تھا کہ کسمسا تا ہوا خود کو خلیفہ کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے برے جیسی چھدتی تیز نظروں کے سامنے مزید سکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے نظریں اٹھائیں، مگر جب خلیفہ کو اپنی ہی طرف دیکھتے پایا تو گھبرا کر نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

”پین برکتے!“ خلیفہ تذبذب سے بولا۔

”پا خلیفہ....“ وہ جیسے لہک کر بولی۔ ”اے ستواہاں اے۔“ اور اس نے یوں مخریہ دیکھا جیسے سات ماہ تیار ہونے والے اس شاہکار کی یہی واحد صفت اور بنیادی خصوصیت بلکہ وجہ شہرت بھی یہی ہے۔

خلیفہ نے ایک مرتبہ پھر پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”پاجی!“ وہ پر جوش لہجہ میں اس کے اوصاف گنوانے لگی.... لمبی تقریری کا خلاصہ یہ تھا کہ اس کے چھوٹے قد، منحنی جسم اور ننھے منے ہاتھ پاؤں پر نہ جاؤ۔ اس کے دن دیکھو یہ بے حد پھرتیلا، شریف محنتی اور وفادار ثابت ہوگا کیونکہ یہ ”ستواہاں“ ہے اور کیونکہ یہ ”ستواہاں“ ہے اس لئے آزمائش شرط ہے۔

خلیفہ نے ایک مرتبہ پھر مشکوک نظروں سے گھورا۔

”یہاں کام بہت ہے۔ صبح سے لے کر رات تک کام۔ طرح طرح کے گاہک.... دیکھ لو۔“

وہ پھر اسی پر جوش لہجہ میں بولی۔ ”کام؟.... بے شک کام ہو.... کتنا ہی ہو یہ شکایت کا موقع نہ دے گا۔ تنگ کرے تو جوتے مار مار کر کھال ادھیڑ دینا اس کی“

”وہ تو خیر ادھرے گی۔“ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے سپاہی مال مسروقہ کو دیکھتا ہے، پھر کیا لانداز میں بولا۔ ”وہ تو ادھرے گی“

... اچھا ٹھیک ہے، کل سے بھیج دو۔“

”سویرے کیوں؟ ابھی سے۔“ اور پھر اسے تقریباً دھکادیتے ہوئے بولی۔ ”چل اوئے!“

خلیفہ نے اسے تھڑے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اب پین برکتے سے مول تول کی بات شروع ہو گئی۔

”خلیفہ جی! مینو کچھ نہیں چاہیدا۔“ وہ ہاتھ پھیلا کر بولی۔

”پھر بھی!“ وہ اس پر ایک نگاہ غلط ڈال کر بولا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ احتجاجاً بولی۔

بہر حال روٹی، پانی اور پانچ روپے روز پر تصفیہ ہو گیا۔ خلیفہ نے یہ وعدہ بھی کیا کہ کام سیکھ لینے کے دو چار ماہ بعد دو روپے کا مزید اضافہ کر دے گا اور اگر سال بھر گزار گیا تو پھر دس روپے روزانہ ملیں گے۔ خلیفہ نے معقول بات کی تھی وہ اسے دعائیں دے رہی تھی پھر اس سے مخاطب ہوئی۔

”دیکھ پتر۔ طویل فصیحیتیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ خلیفہ کو ہمیشہ خوش رکھنا، چوری اور بے ایمانی نہ کرنا، محنت سے جی نہ چرانا۔“

خلیفہ نے پلیٹ میں دو پیڑے ڈال کر دیئے۔ ”کھا پین برکتے۔“

”نہیں نہیں!“ اس نے مرے لہجہ میں نیم دلا نہ انکار کیا۔ ڈیڑھ پیڑا کھا کر آدھا اسے کھلایا اور خلیفہ کو دعائیں دیتی چلی گئی اور یوں وہ بھی اس دن چھوٹا بن گیا۔ دوسرے بہت سے چھوٹوں جیسا چھوٹا۔ چھوٹے، جو جا بجا ملتے ہیں۔ بد لورت، کالے، منحنی، گندی بنیان یا پھٹے کرتے میں ملبوس، پاؤں میں مرمت شدہ ہوائی چپل، منہ پر گریس، بالوں میں راکھ، دانتوں پر میل کی زرد تہہ، سیاہ جسم کی پالش کو چمکاتا ہوا پسینہ۔

”اے چھوٹے پانا پکڑا تا۔“ ”اے چھوٹے پکھا کر۔“ ”اے چھوٹے گریس لگا۔“ ”اے چھوٹے کڑا ہی مانجھ۔“

..... ”اے چھوٹے گراری کس۔“ ”اے چھوٹے!“ ”اے چھوٹے!“ ”اے چھوٹے!“

جہاں تک اس چھوٹے کی ماں برکتے کا تعلق ہے تو اس کی کہانی بھی ان لاکھوں برکتے بی بیوں سے ملتی جلتی ہے جو بالعموم کچی آبادی، کسی جھگی یا پھر سرونٹ کوارٹر میں جنم لیتی ہیں اور کسی ایسی ہی جگہ بیاہ دی جاتی ہیں، کسی ایسی ہی جگہ میں زندگی بسر کرتی ہیں، بچے جننی ہیں اور بالاخر مر جاتی ہیں، البت برکتے کی ماں، جتنے اس لحاظ سے خاصی خوش قسمت سمجھی جاسکتی ہے کہ اس کے والدین گلبرگ کی ایک بڑی کوٹھی میں ملازم تھے۔ باپ، صاحب کا ڈرائیور اور ماں کچن کی ملازمہ گویا جتنے ”نجیب الطرفین“ تھی لہذا فخریہ، یہ دعویٰ کر سکتی تھی کہ میں نے گلبرگ کے بنگلے میں جنم لیا ہے۔ یہ الگ بات کہ صاحب بیڈروم اور سرونٹ کوارٹر میں اگرچہ چند گز کا فاصلہ تھا، مگر یہ

چند گز در حقیقت دو مملکتوں کو جدا کرنے والی نو میز لینڈ تھی کہ عبور نہ ہو سکتی تھی۔

پیدائش پر باپ کو ڈرائیور اور سرورٹ کو اس کے ساتھ لے کر ملا تھا اسی لئے اس پہلی بیٹی کا نام برکت بی بی رکھا گیا۔ اس کے بعد بھی بچے آتے رہے۔ مختلف نام پاتے رہے اور زندگی کی کسی نہ کسی کاہک میں فٹ ہوتے رہے۔ برکت بی بی بھی ایک خانساں کے گھر میں فٹ ہو گئی۔ ایسا خانساں جس نے اپنے فن کے جوہر دکھانے کے لئے امریکہ جانے کے لیے امریکہ جانے کے خواب سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا لیکن پھر حالات و واقعات کے مطابق خواب میں کٹر بیونت کرتا گیا، چنانچہ امریکہ کے بعد کنیڈا، پھر برطانیہ، پھر سعودی عرب میں شاہی محل کا داروغہ مطبخ، پھر دبئی، قطر اور کویت، پھر کوئی سا بھی مقامی فائیو اسٹار ہوٹل لیکن خواب کی تعبیر یہ نکلی کہ وہ ایک نہایت ہی خوشخوار خاتون خانہ کے کچن کا گویا گندہ برتن تھا۔

یہ برکت کا پہلا بچہ تھا مگر دیکھنے میں آخری لگتا تھا۔ ”ستواہاں اے۔“ وہ فخریہ بتاتی۔ اب یہ الگ بات کہ یہ اہم اطلاع دیتے وقت لہجہ کبھی ستا نشانہ ہوتا، کبھی مدافعتانہ تو کبھی معذرت خواہانہ۔۔۔!“

اس کم بخت کو تولانے لانے میں وہ خود چل بسی تھی۔ دائی نے بھی جواب دے دیا تھا۔ ایسے میں مالک نے فرشتہ خصلت ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی گاڑی میں اسے اسپتال بھجوا دیا، یوں وہ عین وقت پر اسپتال پہنچ گئی۔ تمام اتفاقات بھی اچھے لگے یعنی ایرجنسی میں رش نہ تھا، کسی دی آئی پی کی بیوی اس وقت فراغت نہ پا رہی تھی، لہذا ایڈی ڈاکٹر بھی فارغ تھی آپریشن تھیز بھی بالکل خالی اور اینسٹھیسیا والا بھی حاضر تھا۔

واقعی وہ اسم باسمی تھی، جان بھی بچ گئی اور لڑکا بھی۔۔۔!

پہلی مرتبہ دیکھا تو بندریا کے بچے جیسا یہ بیٹا نہ بھایا۔ کالا بھنور، جھریوں والا ماتھا بالوں سے اٹا ہوا، سرکنڈوں جیسے بازو اور تیلیوں جیسی انگلیاں۔

”ہائے اللہ!“ وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

یہ کم بخت باپ کی بجائے مجھ پر جاتا تو کسی آدمی کا بچہ تو نظر آتا، اس نے تلخی سے سوچا مگر جلد ہی بیٹا پیدا کرنے کے فخر نے بقیہ احساسات پر غلبہ پالیا۔ ارد گرد کے کوارٹروں کی عورتیں دیکھنے آئیں تو کپڑے، گز، کھلونے اور پیسے دے کر گئیں۔ جب مالک نے سو روپے دیئے تو وہ نہال ہو گئی، آپ بھی اڑا اڑا پھر رہا تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر اچھا سا نام رکھا مگر چل نہ سکا۔

”یہ تو بہت ہی چھوٹا ہے۔“

”ہائے اللہ! کتنا چھوٹا ہے۔“

”بے چارہ! چھوٹا سا بے بی۔“

”ہاؤ اسمال!“

”لٹل ون!“

اور یوں کوٹھی کے اندر باہر وہ ”چھوٹا“ کہلانے لگا۔ خلیفہ کا چھوٹا بننے سے بھی پہلے، گویا وہ اصلی تے وڈا چھوٹا تھا!

چوک میں آمنے سامنے چھ سات دکانیں تھیں۔ تین چار دودھ دہی اور فالودہ کی ایک آئس کریم ایک سمو سے اور چاٹ کی اور ایک کبابوں کی۔ چوک بہت مصروف تھا ارد گرد کئی دفاتر بھی تھے اسی لئے ان تمام دکانوں پر گاہکوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یوں بھی لاہور کے خوش خوراکوں میں یہ اڈا بہت مشہور تھا اور اسی چوک کی سب سے مشہور دکان اور شخصیت خلیفہ کی تھی۔ بڑے سے بورڈ پوسر خلیفہ کا نام لکھا تھا۔ ”الخلیفہ کا المشہور فالودہ!“

یہ خلیفہ اپنی جوانی میں اندرون شہر کے پہلو انوں کے اکھاڑے کا مشہور کنٹا سمجھا جاتا تھا۔ کشتیاں لڑتا اور خالص گھی ہضم کرنے کی تدبیریں کرتا۔ عمر بڑھی تو انگلری کے درد نے آن دبوچا۔ اکھاڑہ چھٹا تو فالودہ کی دکان آباد کی مگر خلیفہ کا ٹیکا اب بھی برقرار تھا۔ گول چہرہ، موٹی گردن میں گوشت کے تین بل، مگر جیسے بازو چوڑے چوڑے ہاتھ اور گوشت سے تھل تھل کرتا جسم۔ جس گوشت کو جسم کے اور کسی حصہ میں سمائی کی جگہ نہ ملی وہ پیٹ پر جمع ہو گیا کہ ہنسی بند ہونے پر بھی پیٹ ہنستا رہتا!

خلیفہ کی دکان واقعی ”المشہور“ تھی۔ دولہ کے پہلے تھے اور اب ان ہی میں چھوٹا بھی شامل ہو گیا۔

چھوٹا تھا تو ست واہاں، مگر پھرتیاں اس میں دس واہوں جیسی تھی! پہلے دن ہی اس نے خلیفہ پر اپنی کارگزاری کی دھاک بٹھا دی۔ کالج کے لڑکوں کی ٹولی فالودہ کھا کر پیسے دیئے بغیر، قہقہہ لگاتی، موٹر سائیکلوں کو کلک مارنے کو تھی کہ چھوٹے نے اچک کر ایک کے انجن سے چابی نکالی اور اگلی جست میں وہ خلیفہ کے پاس تھا۔

”اوئے تو اڈی.....“

خلیفہ نے نہ جانے کیسے گوشت کہ تہیں سمیٹیں اور لڑکوں کے سر پر جا پہنچا۔ شور سن کر باقی دکان بھی جمع ہو گئے اور تب معلوم ہوا کہ اس سے پہلے بھی وہ ایک دوساتھ ہاتھ کر چکے تھے۔ اب جوان کی دھنائی ہوئی تو دنیا نے تماشا دیکھا۔ اگلے پچھلے حسابات بے باق کئے گئے۔ خلیفہ تو انہیں تھانے لے جا رہا تھا مگر سب نے سمجھا یا اگر بڑے گھروں کے لڑکے نکلے تو لفر پڑ جائے گا دفع کرو بہت ہو گئی ان

کے ساتھ۔

خلیفہ نے خوش ہو کر چھوٹے کودس روپے کا نوٹ انعام دیا، والدین نے تمام علاقہ اور رشتہ داروں میں اس کا رنامہ کا فخر یہ تذکرہ کیا.... چھوٹا ہیرو بن گیا!

چھوٹا بے حد پھرتیلا تھا!

گاڑی سڑک کے دوسرے کنارے پر نظر آتی تو یہ تیز رفتار ٹریفک سے بچتا بچتا تیر کی طرح نکل جاتا اور گاڑی رکنے سے پہلے ہی آرڈر لینے کو تیار ملتا اور پھر اسی پھرتی سے ٹرے میں فالودے، ربڑی اور برف کے پیالے لئے جاتا۔ بعض اوقات اسے پچاس پچاس پیسے بخششیں بھی مل جاتیں۔ کچھ مستقبل گاہک اب اسے پہچاننے بھی لگے تھے اور کبھی کبھار وہ چھوٹے سے ہنسی مذاق بھی کر لیتے۔

ایک دن بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ ایک رات چوک کے تمام چھوٹوں نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ اسے فلم بہت مزے دار لگی، فائٹ کے مناظر پر وہ بھی باقیوں کے ساتھ زور زور سے ہیرو کی ہلاشیری کرتا رہا۔ جب ہیرو نے کلاشکوف کی ایک ہی برسٹ سے درجن پھر پولیس والوں کا پھڑکا دیا تو تمام ہال کی پر جوش تالیوں میں یہ بھی شریک تھا۔ ہیروئن کے ٹھمکوں پر تماشائی اسکرین پر نوٹ اور اس کے وارر ہے تھے۔ چھوٹا ہونے کے باوجود اسے ہیروئن کچھ عجب انداز سے اچھی لگی جسے وہ خود بھی نہ سمجھ پارہا تھا۔ پھر اسکرین پر پیسے پھینکنا بھی ٹھمکوں جیسا ہی حیرت ناک منظر تھا۔ اس کا جی چاہا بھاگ کر جائے اور تمام نوٹ اور سکے سمیٹ لے۔ مگر خود میں ہمت نہ پائی۔ اس نے ساتھی سے پوچھا ”یہ اتنے پیسے کون اکٹھے کرے گا؟“

”چوڑھا“ اس نے لا پرواہی سے جواب دیا۔ تب چھوٹے نے خود کو اس چوڑھے سے بلند محسوس کیا، ایک بار تو بے اختیار اس کا بھی ہاتھ جیب کی جانب چلا مگر وہ چوڑھے سے اس حد تک بھی بلند ہونے کو تیار نہ تھا!

وہ پہلی مرتبہ آدھی رات کو گھر پہنچا تھا ماں نے کنڈی کھولتے ہوئے غنودگی میں پوچھا۔ ”بڑی دیر کر دی چھوٹے۔“ ”آج گاکی بہت زیادہ تھی۔“

”اچھا! اچھا!“ وہ دھم سے بستر پر گر گئی۔

چھوٹا خود کو بہت بڑا محسوس کر رہا تھا۔ اس رات اس نے خواب دیکھا، سوں رب دی! بہت ہی برا خواب!

چھوٹے کی ترقی ہو چکی تھی!

خليفة اگر چه اس سے بالعموم خوش ہی رہتا تھا مگر جب غصہ میں آتا تو پھر گالیوں سے آغاز کرتا، کبھی کبھار دو چار جڑ بھی دیتا، جب سستی کے موڈ میں ہوتا تو صرف مرغ بنانا تو ایک کھیل تھا ان کے لئے، گو چھوٹے کی بھی دو چار مرتبہ گرد جھاڑی جا چکی تھی مگر ہنوز مرغ بنانا نہ تھا۔ رہی گالیاں تو وہ خلیفہ کا تکیہ کلام تھیں۔ لوہاڑی بھائی کے لہجہ کی کڑکڑاتی خالص لاہوری گالیاں، جنہیں فرصت کے اوقات میں چھوٹے ایک دوسرے کے لئے استعمال کرتے اور پھر کھی کھی کرتے۔ چھوٹا تیزی سے لپکا!

بڑی سفید کارلش کر رہی تھی جس میں ویسی ہی لٹل لٹل کرتی لڑکیاں بھری تھیں۔ صرف ایک بھوند سا مردان کے ساتھ تھا جس کے ساتھ اگلی سیٹ پر آتشیں گلابی رنگ کے سوٹ میں ملبوس گہنوں سے لدی ایک لڑکی براجمان تھی۔ چھوٹے نے اندازہ لگایا، ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے جیسی تو دلہن کے ”چھوٹے“ نے گرمیوں میں بھی سوٹ پہن رکھا ہے اور یہ جو پچھلی سیٹ پر پھل جھڑیاں ہیں یہ سالیان یا سہیلیاں ہوں گی۔ اس نے ”چھوٹے“ کو نظر انداز کرتے ہوئے دلہن کو بتیسی نکال کر سلام کیا۔ ”سلام آ پاجی!“ اسے دیکھ کر پچھلی سیٹ کی پھل جھڑیاں انار میں تبدیل ہو گئیں۔

دلہن نے بھی اسے مسکرا کر دیکھا۔

”ہاں دیکھو!“ دلہن کا چھوٹا بولا۔ ”چھ فالدوے.....“ ”جی جناب!“

”ذرا جلدی لانا!“ ایک پٹاخہ بولی۔

چھوٹے نے جو اسے آنکھ بھر کر دیکھا تو آنکھوں میں جیسے اجالا اتر آیا۔ ہونقوں کی طرح منہ کھولے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ ”بھئی

جلدی کرو!“ وہ ہنسی۔ ”جی... جی!“ وہ مسکرایا۔ ”جی....“

چھوٹے کو پر لگ گئے احتیاط سے پیالے سجا کر لایا۔

”شباباش!“ وہ بولی۔

وہ نہ جانے کیوں شرما گیا، مگر اس کا شرمانا ویرانے کا پھول تھا، سب فالودہ کھا رہی تھیں، ہنس رہی تھیں، بول رہی تھیں، چھوٹا صرف اسی پٹاخے کو دیکھے جا رہا تھا۔ فالودہ کھاتی وہ کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔ آج اندازہ ہوا کہ فالودہ کتنی اچھی چیز ہے اور اس کے کھانے کے کتنے فوائد ہیں اور یہ بھی کہ ہر شخص فالودہ کھاتا ہوا خوبصورت بھی نہیں لگ سکتا۔ گرمیوں میں گرم سوٹ پہننے والے چھوٹے نے ایک روپیہ بخشش دی تو اس نے لمبی سلام کی، یہ سلامی پٹاخہ کو دی تھی مگر مرد سمجھا مجھے دی ہے....!

اس پٹاخے نے نہ صرف فلم کے اثرات دھو ڈالے بلکہ اپنا بہت گہرا اثر بھی چھوڑ گئی۔ کیا ٹھنڈی ٹھاٹھ کی ہے... فالودہ جیسی سفید!

کئی دن تک وہ اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ سوچوں میں مگن رہنے کی بنا پر خلیفہ سے دو ایک مرتبہ گالیاں بھی کھالیں۔ تب اچانک کڑا ہی مانجھتے ہوئے اس پر انکشاف ہوا کہ وہ تو ”اسک“ میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ اس نے گھبرا کر سوچا، اس ”اسک“ نے اسے پریشان بلکہ خوفزدہ سا کر دیا۔ کیا بنے گا میرا؟ اس لئے بے بسی سے خود سے سوال کیا۔

اور پھر دوبارہ آنے کی دعا قبول ہو گئی۔ دور سے گاڑی دیکھی تو اس تیزی سے جھپٹا کہ ایک تیز رفتار رکشا کے نیچے آتا آتا بچا۔ یقیناً وہی گاڑی تھی، مگر آج تمام پھلجڑیاں نہ تھیں رف ایک خوبصورت لڑکا ڈرائیور کی سیٹ پر تھا اور اس کے ساتھ اسی کی پٹانہ چھوٹے کا دل ڈوب گیا۔ غم و غصہ بلکہ رقابت نے سینہ میں آگ بھردی۔ اس نے ایک نظر پٹانہ پر ڈال مگر وہ ہنس ہنس کر نو جوان سے باتوں میں مصروف تھی۔

”جی؟“ چھوٹا منتظر تھا۔ ”ہاں کتم کیا لوگی؟“

”فالودہ۔“ وہ زور سے بولی۔ ”اس روز ہم نے یہیں سے کھایا تھا، بہت ٹیسی تھا۔ میرے خیال میں یہی لڑکا تھا۔۔۔۔۔ کیوں چھوٹے؟“ ”جی!“ وہ سرخ ہو کر بولا۔

”تو پھر بھاگ کر دو پیالے لے آؤ۔“

”مگر جلدی سے۔“ وہ بولی ”قلم کا ٹائم نکلے جا رہا ہے۔“

آج چھوٹا سلوموشن میں تھا۔

وہ قسم کھا سکتا ہے کہ اس کا کوئی ارادہ نہ تھا، مگر نہ معلوم ہاتھ کیسے کانپا کہ لڑکی کی گود میں فالودہ کا پیالہ الٹ گیا۔ پٹانہ کی چیخ قابل شندی تھی۔ لڑکا غصہ سے بولا۔

”اوہ! یواسٹوپڈ!“

شور سن کر خلیفہ بھاگا بھاگا آیا اور غصہ میں صرف اتنا کہہ سکا۔ ”اوئے چھوٹے؟“

لڑکی رو رہی تھی لڑکا غصہ میں بولے جا رہا تھا۔

اگر خلیفہ اس وقت ایک پہلوانی ہاتھ جڑ دیتا تو چھوٹا چیس بول جاتا مگر اس نے صرف یہی کہا۔

”اوئے چھوٹے! چل اوئے کن پھر۔۔۔۔۔ مرغا بن جا۔“

اس نے ایک مرتبہ خلیفہ کی جانب بے چاروگی سے دیکھا۔

”اتھھے ایناداے سامنے..... چل اوئے کھوتے دے پتر!“

لڑکی رونا بھول کر گفتگوں رہی تھی۔

چھوٹا ایک دو لمحے گوگلوں کے عالم میں کھڑا رہا پھر خاموشی سے جھکا اور ٹانگوں میں سے ہاتھ نکال کر کان پکڑنے لگا، البتہ آنسوؤں سے لبریز ہونے سے پیشتر چھوٹے کی آنکھوں نے اسے اپنی جانب ہنستے ہوئے دیکھتا پایا!

چھوٹے کو یوں لگا جیسے اس کے دل پر چھایا ہوا غبار اچانک چھٹ گیا ہو۔ اس نے اطمینان بھری سانس لی اور مرغا بن گیا۔



کافر

جب بڑی دیر تک بند دروازہ نہ کھلا تو اس سے رہا نہ گیا، بے آواز اٹھی اور دروازے کے قریب پہنچ کر اندر کی سن گن لیتی رہی، خاموش کمرے میں سے صرف ایک ہی آواز ابھر رہی تھی، آواز کیا تھی اندھے کنویں مڑن مردہ بازگشت کی گونج تھی، گلے میں پھنسی رندھی آواز شاید روتا ہوا بول رہا تھا یا بولتا ہوا رو رہا تھا، وہ کیا کہہ رہا تھا، سمجھنے کی کوشش کی مگر سمجھ نہ پائی۔

وہ سانس روکے لکڑی کے تختہ کی مانند تھی، وہی تختہ جو بے رنگ اور جھریوں والے دروازہ کی صورت میں اس کے اور خاوند کے درمیان آہنی پردہ سے بھی بڑھ کر سخت ثابت ہو رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ دروازہ اندر سے بند نہیں اور وہ اندر جاسکتی ہے، مگر یہ بھی اندازہ تھا کہ خاوند پردہ دری پسند نہ کرے گا۔

کیا کرے؟ جی مچل اٹھا، خاوند کو تسلی دینے کو کسی بچہ کی مانند اسے اپنی ہکل میں چھپالے، آنسو پونچھتے، تھپک تھپک کر سلا دے، مگر خاوند کا آنسو بھرا چہرہ بھی تو دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ کچھ دیر تک وہ گوگوں کے عالم میں رہی پھر ٹھنڈی سانس بھر کر واپس مڑ گئی یہ پہلا موقع نہ تھا اور یہ بھی جانتی تھی کہ یہ آخری بھی نہ ہوگا۔

مدد کے اعصاب پاؤں تلے پھسلتی چکنی مٹی کے سوندھی مہک سے سرشار تھے، دل باؤ لے پنچھی کی مانند تھا، پاؤں مٹی کے دائرے میں رقصاں تھے۔ چھپاک، چھپاک، چھپاک، چھپال! کچھڑ میں متحرک پاؤں آواز پیدا کر رہے تھے، مچلتے پاؤں کی دیعا لگی چھینٹوں کی ہو لی کھیل رہی تھی، اس کی رانیں بازو، سینہ اور چہرہ تک پر چھینٹوں کی نقاشی تھی۔ صرف ایک لنگوٹی میں اس کا سیاہ چمک دار جسم پسینہ سے بھیگ رہا تھا مگر وہ گرمی اور پسینہ سے بے پروا اپنی حرکت کے دائرہ کا اسیر تھا۔

گھومتے چاک کے درمیان مٹی کا بڑا سا پیڑا۔ باپ کے مشاق ہاتھوں میں مردہ مٹی جیسے جی اٹھی ہو، گویا خود بخود پیکروں میں ڈھلتی جا رہی ہو، چاک کی گردش کے ساتھ اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھی گھوم رہی تھیں۔ اگرچہ چاک کی گردش سر کی گردش میں تبدیلی ہو جاتی مگر وہ کھیل سے نہ اکتاتا، پہروں بیٹھا باپ کے مستعد ہاتھوں کی نپی تلی جنبش دیکھتا رہتا وہ جو ٹھوٹھی محسوس ہو رہی تھی کیسے آنسو درہ میں تبدیل وہ گئی اور کیسے وہ دھاگہ سے گھومتے چاک پر سے برتن کو کاٹ کر مٹی کے پیڑے سے الگ کر لیتا۔ مدد کے لئے یہ تذبذب بھرا لمحہ ہوتا۔ دھاگہ گھومتے چاک سے برتن جدا کرنے میں کامیاب رہے گا یا نہیں۔ کیونکہ ذرا سی غلطی محنت کو برباد کر سکتی تھی اور کوزہ کا

کچھ اور ہی بن سکتا تھا۔ مگر نہیں... باپ کا لالرش ہاتھ اس صفائی سے گھومتے چاک پر سے برتن اٹھاتا گویا گلدان سے پھول نکالا ہو مدد کا دل جھوم اٹھتا۔

مدد اس دن کا شدت سے منتظر تھا جب وہ بھی باپ جیسی مہارت سے کوزے پیالے مرتبان رکابیاں ٹھوٹھیاں اور دیئے بنائے گا۔

شام کے پچھلے پہر سورج کی ترچھی شعاعیں ظروف کے ساتھ روشنی اور سایہ کا کھیل کھیلتیں تو وہ کسی اور ہی روپ میں نظر آتے۔ نیم روشن دائرے تاریک قوسیں، خم پر روشنی کی چمکتی لکیر اور باقی برتن پر پھیلا سایہ۔ نصف ہانہ منور اور نصف تاریک مدد کے لئے یہ سب سے بڑا جمالیاتی تجربہ تھا۔ اور پھر اس سے بھی بڑا جمالیاتی تجربہ صغراں ثابت ہوئی جب تک صغراں بیاہ کر گھر نہ آئی تب تک وہ محض مدد ہی رہا تھا۔ بالغ بچہ! جس کی زندگی کی تمام سرستیں صرف مٹی اور چاک کی گردش سے مخصوص تھیں اور اس کی زندگی کا محو چاک ہی تھی اور اس نے گھومتے چاک کے دائرے پر پیکر بدلتی چکنی مٹی کے علاوہ اور کچھ سوچا ہی نہ تھا، لیکن صغراں کا گھونگھٹ اٹھایا تو وہ محض مدد سے امداد بن گیا۔

صغراں کا خمیر کس مٹی سے اٹھایا گیا تھا اس کا جسم کس چاک پر بنایا گیا تھا وہ یہ نہ بوجھ پایا۔ اس لوچدار مٹی میں سیاہ نمک کی کیسے آمیزش کی گئی ہوگی یہ بھید اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ صغراں چکنی مٹی میں لوچ تو تھی ہی مگر اس کے علاوہ اور کچھ بھی خمیر میں شامل تھا کہ وہ بیک وقت ملائم بھی تھی اور سخت بھی اور گیلی چکنی مٹی کی مانند چاک پر وہ بھی ہر سانچہ میں ڈھل سکتی تھی۔ ساس کی تابعدار ساس کی خدمت گزار سارا دن کام میں جتنی رہنے والی وہ کوزہ تھی کہ کوزہ مصری؟

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

وہ جھینپ کر خاموش رہا۔

”بولتے کیوں نہیں؟“

”وہ.... وہ میں۔“

”آخر یہ ہے کیا؟“

”تم!“

وہ کھلکھلا کر ہنسی تو سفید دانت شام کے سائے میں اڑتے بگلوں کی سفیدی جیسے تھے۔ ”ہائے اللہ... میں؟“

وہ اسے داد طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے ڈھنگے پتلے کو دیکھ کر بولی۔ ”اس سے بہتر تو بڈاوا ہوتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ دفاعی انداز میں بولا۔ ”مگر..... مگر میں نے سوچا تمہاری مورت بنا کر رکھ لینی چاہیے۔“

”کیوں بھی؟“

”ویسے ہی۔“

صفراں کا دل چاہا کہ اس تھن متھنی کو ختم کر دے مگر امداد کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی، تاہم وہ ہنسی نہ روک سکی۔

”ہنس لو! ہنس لو“ وہ گہمیر لہجہ میں بولا۔ ”جب یہ مورت بنے گی تو.....“ اس نے ہنس کر بات کاٹی۔ ”تو مانیں بچوں کو اس سے ڈرایا کریں گی.....“ اس پر وہ بھی ہنس دیا۔

امداد کے دل سے مورت بنانے کی خواہش نہ جاسکی جب بھی فارغ وقت ملتا مورت بنانی شروع کر دیتا۔ ایسی مورت جس کا صفراں یا کسی بھی صفراں سے کوئی تعلق نہ ہوتا اور یوں ہاتھ صاف ہوتا گیا اور اسی مشق نے یہ نکتہ بھی سمجھایا کہ ان کوزوں اور ٹھوٹھیوں کے مقابلے میں کھلونے بنانے میں زیادہ کمائی ہے۔ یوں طوطے چڑیاں اور کونے بنانے شروع کر دیئے۔ صفراں نے رنگ سازی کا کام سنبھالا۔ یہ تجربہ توقع سے بڑھ کر کامیاب ثابت ہوا۔

اور پھر کھلونے بنانے والوں کو خود ایک کھلونا مل گیا۔

مولوی جی کو بطور خاص مسجد بلا کر کان میں اذان دلوائی گئی۔ ”مولوی صاحب! اس کا کوئی اچھا سا نام بھی رکھ دیں۔“

”بھی تمہارا بیٹا ہے، خود کیوں نہیں رکھتے۔“

”جی میں تو رکھ لوں۔“ وہ بولا۔ ”مگر اس کی ماں کی خواہش ہے آپ نیک، پاک بندے ہیں کوئی مبارک سا نام رکھ دیں۔“

مولوی صاحب نے چند لمحہ توقف کیا، پھر بولے۔ ”محمود! محمود بہت اچھا نام رہے گا۔“

”جی مولوی صاحب!“ سب نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

پیدائش کی خبر سن کر ناچنے والے آگئے۔ آج کالے رنگ اور نیلے پیلے کپڑوں والی یہ مخلوق اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ بھدی آواز میں گاتے ہوئے رقص کے نام پر کچھ حرکات بھی کر رہے تھے جن پر اسے ہنسی کی بجائے پیار آ رہا تھا۔ ماں نے آٹا اور گڑ دیا تو اس سے بھی نہ رہا گیا۔ اچھلا اور جیب میں سے سرخ نوٹ نکال کر بیٹے پر سے وار کرنا چنے والے کے کھر درے ہاتھ میں تھما دیا۔ نوٹ نے طاقت کے انجکشن کا کام کیا، آواز میں لہک پیدا ہو گئی اور رقص میں زیادہ شدت آ گئی مگر اس وقت تو سب ہنسی سے لوٹ

پوٹ ہو گئے جب اس نے بھی جوش میں آ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچ شروع کر دیا۔

”ہائے میں مری۔“ صغرا منہ میں دوپٹہ دیئے ہنس رہی تھی۔ دیکھنے والوں نے تالیاں بجا کر خوشنودی کا اظہار کیا!

جس دن محمود نے اس کے پیٹ پر بیٹھ کر پہلی مرتبہ دھار ماری، امداد سارا دن ناچتا پھرا۔ امداد کی خوشی دیدنی تھی۔ گردن اکڑی، سینہ تنہا ہوا اور چال میں رقص کا سا انداز! کمہاروں کے اس گھرانے کی خوشی نقطہ عروج تک پہنچ چکی تھی۔

بحث شروع ہو جاتی۔

”میں اسے مولوی صاحب کے مدرسے میں بھیجوں گی۔“

”کیوں بھیجی۔“

”پڑھنے لکھنے کے لئے!“

”پڑھنے لکھنے کے لئے کیوں؟“

”تاکہ بابو بنے.... بڑا آدمی بنے۔“

”بابو کیوں بنے؟“

”تاکہ تمہارے کھلونے خریدے۔“ وہ زچ ہو کر کہتی۔

”دیکھو صغرا!“ وہ بچوں کی طرح اسے سمجھاتا۔ ”یہ ہمارا خاندانی پیشہ ہے، گھر کا ہنر چھوڑ کر دفتر کا بابو بننے میں کیا رکھا ہے۔“

”کچھ تو رکھا ہے۔“

”کیا؟“

”سای دنیا کیوں اسکولوں کالجوں میں جاتی ہے؟“

”وہ کمہار نہیں... اس لئے۔“

”واہ!“ وہ ہنسی۔ ”کیا بات ہے، وہ کمہار نہیں۔“

”اور کیا.... اور ہاتھ کے ہنر کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔“

یہ بحث روز ہوتی مگر بے نتیجہ رہتی۔ ویسے بھی ابھی یہ اس کے پڑھنے کے نہیں بلکہ کھیلنے کے دن تھے۔ وہ بیٹے کو کھیلنے کے لئے مٹی

دے دیتا اور پھر مٹی سے بھرے ہاتھ دیکھ کر نہال ہوتا۔

وہ سوچتا شاید صغراں ٹھیک ہی کہتی ہے۔ اگر یہ پڑھ لکھ جائے تو ہم برتن بنانے کی بجائے برتنوں کی فیکٹری لگا سکتے ہیں اور یوں محض کمہار نہ رہیں گے۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ معاشرہ میں اس کی کوئی عزت نہیں۔ اس کے مقابلے میں کچھری کارشوت خود چپڑا سی زیادہ شریف اور معزز تھا۔ مولوی صاحب اسے خود سلام کرتے تھے۔ اس نے مسجد کے لوٹوں کی ان سے کبھی بھی قیمت طلب نہ کی تھی، اللہ کے پاک گھر کے نیک نمازی اس کے بنائے ہوئے لوٹوں سے وضو کریں اس کے لئے یہ بہت بڑی نیکی تھی، مگر مولوی صاحب نے آج تک اسے صحیح نام سے نہ پکارا تھا جب بھی بلا مدو کہہ کر ہی بلایا۔ حالانکہ وہ مردہ مٹی میں جان ڈالتا تھا، محنت اور ایمانداری سے روزی کماتا تھا مگر وہ عمر بھر مدو ہی رہا اور مرتے دم تک مدو ہی رہے گا۔ تو پھر وہ اپنے بیٹے کو کیوں مواد بنائے، وہ محمود بلکہ محمود صاحب کیوں نہ کہلائے۔

مگر یہ منصوبہ دھرے کے دھرے رہ گئے کہ مختصر بیماری نے محمود کو نگل لیا!

اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا سب سے پیارا کھلونا کفن میں لپٹا، بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ”اب میری آواز پر میری طرف کبھی دوڑ کر نہ آ سکے گا، نہ کھلونوں سے کھیلے گا نہ کھلونے توڑے گا، نہ بڑا ہوگا، نہ پڑھے گا اور نہ محمود صاحب کہلاوے گا۔“ اس نے آنکھ بھر کر دیکھا، چہرہ کی معصومیت کو موت بھی نہ چھین سکی تھی۔ وہ ساکت کھڑا تھا کانوں میں وادی اور ماں کے رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ باب نے تسلی کو کا ندھے پر ہاتھ رکھا تو اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

مولوی صاحب نے نام رکھا تھا اور وہی نماز جنازہ پڑھا رہے تھے۔

جس مٹی سے اسے پیار تھا، جس مٹی کا وہ فن کار تھا اور جو مٹی اس کی تابعداری تھی اس کو اپنا بیٹا سو نپ کر قبرستان سے پلٹا تو وہ ٹوٹے برتن سے بھی زیادہ ٹوٹا ہوا تھا۔

وہ جو کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مہم ہے مگر باپ کے لئے یہ مہم کارگر ثابت نہ ہوا، سب نے حتیٰ کہ ماں نے بھی صبر کر لیا مگر اسے صبر تھا نہ سکون اور نہ قرار۔ بس باؤلا باؤلا سا پھرتا رہتا۔ چاک پر بیٹھا تو چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

ایک صبح صغراں اٹھی تو نظر مٹی کے پتلے پر پڑی وہ غالباً رات بھر کام کرتا رہا تھا آنکھیں سرخ، گال اندر کودھنے، بال پریشان اور کپڑے گندے۔

”یہ کیا ہے؟“

”محمود۔“

”کیا؟“

”ہاں! یہ میرا محمود ہے۔“

وہ سن، کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو۔“

جھنجھلا کر بولا۔ ”دیکھتی نہیں ہو، محمود بنا رہا ہوں۔“

وہ رونے لگی۔ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیوں پاگلوں جیسی باتیں کرتے ہو تم۔“ وہ چڑ کر بولا۔ ”پاگلوں جیسی باتوں کا کیا مطلب؟ مٹی نے میرا محمود لیا تھا میں اسی مٹی سے اپنا محمود واپس چھین رہا ہوں۔“

”مگر.....“

”جھلے! اتنی سی بات نہیں سمجھتی۔“

وہ خاموشی سے روتی رہی۔

اب جو وہ بولا تو اس کی آواز میں عجب ملائمت آ گئی۔ ”دیکھ صغرا! دیکھ تو ویسا ہی ہے نا، میرے محمود جیسا، وہی ماتھا، وہی کان اور ناک تو بالکل میری ناک جیسی ہے۔ تو ہی تو کہا کرتی تھی کہ اس کی ناک عین میں میری ناک جیسی ہے اور یہ دیکھو۔ یہ ٹھوڑی بھی، ہر چیز میں نے درست بنا دی ہے۔“ وہ شفقت بھری نظروں سے نامکمل پتلے کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”بس ذرا اس کی ٹانگیں اور پاؤں بن جائیں پھر تمہیں یقین آ جائے گا...“

مگر صغرا کی آنسو بھری آنکھیں تو یہ دیکھ رہی تھیں کہ محض مٹی کی چند ڈھیریاں تھیں جن میں ان کے محمود یا کسی بھی بچہ کی شبیہ نہ تھی، مگر وہ مگن تھا۔ وہ دن بھر مصروف رہا اور شام سے پہلے اپنا محمود بنا کر اسے سوکھنے کو دھوپ میں ڈال رہا تھا کہ مولوی صاحب آ گئے، انہیں کچھ لوٹوں کی ضرورت تھی۔

”مدد۔“ انہوں نے آواز دی۔

”جو مولوی صاحب۔“

”کیا کر رہے ہو؟“

”جی کچھ نہیں۔“

”پھر بھی!“

”جی ویسے ہی۔“

”اور.... اور یہ کیا ہے؟“

انہوں نے چھڑی کی نوک مٹی کے اس عجیب الخلقہ لوتھڑے کی طرف کر کے پوچھا۔

”یہ میرا محمود ہے۔“

”کیا بکتا ہے۔“

”ہاں جی!“ وہ بچوں جیسی معصومیت سے بولا۔ ”اسے میں نے بنایا ہے جی ساری رات اور دن بھر کام کیا ہے اس پر!“

مولوی صاحب حیرت سے منہ کھولے سبھی مدو کو اور کبھی اس کے محمود کو دیکھ رہے تھے۔ وہ فخریہ لہجہ میں بتا رہا تھا۔ ”یہ دیکھئے ہے نا

اسی جیسا میرے محمود جیسا... وہی ناک، وہی بال، وہی ہونٹ اور وہی مسکراہٹ۔“

مولوی صاحب نے اپنے کانوں اور چہرہ کی طرف خون دوڑتا ہوا محسوس کیا، ان کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ”دیوانہ ہو گیا ہے؟“

انہوں نے لہجہ کو ملائم کر کے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا مگر اس کے برعکس آواز گرج میں تبدیلی ہوتی جا رہی تھی، گھر والے نیم دائرہ کی صورت میں کھڑے تھے۔

”نہیں مولوی صاحب!“ اس کے لہجہ میں فخر و انبساط تھا۔ ”یہ میرا محمود ہے اسے میں نے بنایا ہے۔“ اس نے ایک لمحہ کو ماں باپ

بیوی، مولوی صاحب کو دیکھا پھر اس کی نگاہیں محمود پر جم گئیں اور وہ پرتیقن لہجہ میں بولا۔ ”اسے کوئی چھین سکے گا..... کوئی بھی نہیں!“

”کیا بکتا ہے کافر، نامراد۔“

مولوی صاحب اب جلال میں آچکے تھے، غصہ سے داڑھی دانتوں میں دبا رکھی تھی، وہ طیش سے کانپ رہے تھے۔

”مردود! کیا کفر بک رہا ہے۔“

ان کی چھڑی اٹھی، لہرائی، اور اگلے لمحہ باپ کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے اپنے محمود کو مٹی کے ڈھیروں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔

”مولوی صاحب خبردار....“

یہ چیخ تھی کہ لاکڑ و حشت کی پکار جنون کا اظہار اس نے اچک کر مولوی صاحب کا گلا دبوچ لیا، سب امداد سے لپٹ گئے، اب

خوفزدہ مولوی صاحب خود کو اس سے چھڑانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ امداد کے حلق سے بے ربط آوازیں نکل رہی تھیں، وہ

کانپ رہا تھا اور ہاتھوں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو اس کے ہاتھوں کے شکنجے سے نکالا گیا۔ امداد کا

باپ مولوی صاحب سے معافی مانگ رہا تھا ماں اور بیوی رو رہی تھیں۔

امداد کا سینہ دھونکنی کی مانند تھا اور جسم میں لرزہ وہ کچھ دیر تک دونوں بازو پھیلائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مٹی بنے محمود کو دیکھتا رہا پھر وہ کٹے درخت کی مانند اس پر گر گیا۔ باپ کے آنسو گالوں سے بہہ بہہ کر دوسری میت کو غسل دے رہے تھے۔



لب پہ آتی ہے دعابن کے تمنا....

”اے پروردگار! آج عیدالضحیٰ کے مقدس دن ہم تیرے حضور میں ہیں! ہماری دعا قبول فرما!“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! ہم آج تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو قربانی دیں گے اسے قبول فرما۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے اللہ! ہمارے جو بھائی قربانی دینے کے قابل نہیں تو اگلے برس انہیں اس قابل کر دے کہ وہ بھی قربانی دے سکیں۔“

عید کے گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”رب العالمین! کل عالم کے حاجیوں کا حج قبول فرما۔“

عید کے گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”یارب! ہم میں سے جو مومنین حج کی سعادت حاصل کرنے کے قابل نہیں ہیں تو انہیں اس کی ترفیق عطا فرما۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”یا باری تعالیٰ! ہم سب کو حج اور قربانی کی توفیق عطا فرما۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”پاک پروردگار! جن حاجیوں نے دوران حج موت کی سعادت حاصل کی تو جنت الفردوس میں ان کے درجے بلند فرما۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”رب علام! ہم میں سے جو بیمار ہیں انہیں شفاء کا ملہ عطا فرما۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے کائنات کے مالک! ہمارے علاقے کے جو حضرات انتقال فرما گئے ہیں ان کی کلی بخشش فرما۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! بیواؤں کی دستگیری فرما۔“
 عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین“
 ”اے خدا! یتیموں کا حال درست فرما۔“
 عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا سب پر رحمتیں نازل فرما۔“
 عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا! پاکستان کے مسلمانوں پر رحمتیں نازل فرما۔“
 عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا پاکستان پر نور کی بارش نازل فرما۔“
 عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا! کشمیر کا مسئلہ حل فرما۔“
 عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین“
 ”اے خدا! بوزنیا کے مسلمانوں کی مشکلات آسان فرما۔“
 عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا! تمام دنیا کے مسلمانوں کی مشکلات دور کر دے۔“
 عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین“
 ”اے میں خدا! کل عالم میں مسلمانوں کو بلند اقبال فرما۔“
 عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا! فلسطین کا مسئلہ حل فرما۔“
 عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا! یہودی ہمارے سب سے بڑے دشمن ہیں ان سے پاکستان کو محفوظ رکھ۔“

عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! ہمیں ہندوؤں کی سازشوں سے بچا۔“

عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

اے خدا افغانستان میں پاپیدار امن قائم فرما۔“

عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“ اے خدا! ہمیں بھارت کے شر سے محفوظ رکھ۔“

عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! سلمان رشدی جیسے لوگوں کو برباد کر۔“

عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! بابر مسجد ڈھانے والوں کو غارت فرما۔“ عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا!! ہمارے علاقہ کے ایم پی اے حاجی کرم داد کی اہلیہ شدید بیمار ہیں انہیں کلی صحت عطا فرما۔“

عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! ہمارے علاقہ کی ممتاز سماجی شخصیت حاجی اللہ یار کا صاحبزادی امریکہ میں زیر تعلیم ہے اسے اس کے امتحان میں کامیاب

فرما۔“

عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! ہمارے علاقہ کے کنسلر حاجی جمال الہی کی ہمیشہ علیل ہیں انہیں کلی صحت عطا فرما۔“

عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! ہمارے علاقہ کے رئیس کے صاحبزادے اور مرکزی وزیر کے داماد جناب رحمت الہی سی ایس پی قضائے الہی سے انتقال

فرما گئے ہیں ان کی مغفرت فرما۔“

عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنا دے۔“

عید گاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! پاکستان کو عالم اسلام کے لئے مثال بنادے۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! پاکستانیوں کو سب سے افضل بنادے۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”پاکستان کو کل عالم میں سرفراز فرما۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”پاکستان کو کافروں کے شر سے بچا۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! پاکستان کو محمدوں کے شر سے بچا۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! پاکستان کو دہریوں سے بچا۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! پاکستان پر اپنی رحمتیں نازل فرما۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! پاکستان پر اسلامی نظام نافذ فرما۔“

عیدگاہ کے تمام نمازی ”آمین!“

”اے خدا! ہمیں سچا مسلمان بنا۔“

عیدگاہ کے کچھ نمازی ”آمین!“

”اے خدا! ہمیں اسلام کے سچے اصولوں پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔“

عیدگاہ کے کچھ نمازی ”آمین!“

”اے خدا! ہمیں گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔“

عید گاہ کے کچھ نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا! ہمیں حقیقی نماز کی توفیق عطا فرما۔“
 عید گاہ کے کچھ نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا! پاکستان سے رشوت کی لعنت ختم کر دے۔“
 عید گاہ کے چند نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا! رزق حرام سے محفوظ رکھ۔“
 عید گاہ کے چند نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا! سفارش کی لعنت سے نجات دلا۔“
 عید کے چند نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا! گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔“
 عید گاہ کے ایک دو نمازی ”آمین!“
 ”اے خدا! سچا مسلمان بنا دے۔“
 عید گاہ کے سب نمازی خاموش
 ”اے خدا! ہمیں مرد مومن بنا دے۔“
 عید گاہ کے سب نمازی خاموش
 ”اے خدا! صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما!“
 عید گاہ کے سب نمازی خاموش
 ”اے خدا! ہمیں حقیقی مسلمان بنا دے۔“
 عید گاہ کے سب نمازی خاموش



بچھو سے ملاقات

تھکن سے چور ہو کر ریت پر مردہ پرندے کی مانند گرا تو خاصی دیر تک وہ شوکتی ہواؤں میں صرف سانس کی پھنکار سناتا رہا۔ پسلیوں کے پنجرے میں بند دل مرغ نو گرفتار کی مانند تھا۔ سوکھے حلق میں اترتی سانسیں خشک آبشار تھیں۔ ٹکان سے کھلائے ہو جھل پوٹوں کو تمازت سے سکڑی آنکھوں پر گرنے سے بمشکل روکتے ہوئے چھاگل سے پانی کا گھونٹ بھرا، مگر اسے کانٹوں بھرے حلق سے فوراً نیچے اتارنے کی بجائے منہ میں گھماتا رہا۔ خشک تالو کو طراوت کا احساس ہوا اور پھڑپھڑائے ہونٹوں پر بھیگی زبانوں نے نمی بکھیری تو طمانیت سے آنکھیں خود بخود کھلتی گئیں۔ دیر تک پانی کا گھونٹ منہ میں رکھے خشکی کا ذائقہ چکھتا رہا۔ اس کے بعد اس گھونٹ کو جواب گرم ہو چکا تھا آہستہ آہستہ معدے میں یوں منتقل کیا گیا جیسا کہ امانت سونپ رہا ہو۔ معدہ خوشی سے چپھایا۔ ایک اور گھونٹ بھرا اور پھر ایک اور۔

اب وہ شاداب شجر کی مانند خود کو تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔ گردن گھما کر چاروں اور پھیلے ریت سمندر پر نظریں دوڑائیں۔ ہوا الوہے کے زنگ جیسی ریت موجوں کو کروٹیں دے رہی تھی، یوں کہ افق تک پھیلا جگر جگر کرتا تھل گویا جل میں تبدیل ہو گیا۔

اب اسے پشت پر شجر کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ہریالی سے عاری اس برق گزیدہ شجر کی سیاہ شاخیں مردہ جسم کے بازوؤں کی مانند خشک تھیں۔ تنے سے ٹیک لگائی تو کمر میں چھال کی کھردراہٹ کھتی چلی گئی۔ تاہم سکون کے احساس سے آنکھیں بند کر کے ٹانگیں پساریں تو سینے نے اطمینان کی ایک طویل سانس خارج کی۔ دل اب سکون کی رفتار سے دھڑک رہا تھا، نظر کے پرندے ریت سمندر کی خشک موجوں میں غوطے لگا رہے تھے، مگر کہیں بھی ہریالی کی مچھلی نہ دکھائی دی۔ اکڑی ٹانگوں میں تھکن کی سرسراہٹ تو محسوس کی جاسکتی تھی مگر اس کے اعصاب پر سکون تھے۔ سوکھے گوشت اور پنیر کا ٹکڑا تھیلے سے نکالا اور آہستہ آہستہ کترنے لگا اور پھر جتنی دیر تک چبا سکتا تھا وہ چباتا رہا حتیٰ کہ گوشت، پنیر اور لعاب یک جان ہو گئے اور جب یہ معدے میں اترے تو نہال ہو گیا۔ اوپر سے پانی کا ایک اور گھونٹ لیا تو سرشار ہو گیا۔ خشک تناسل کے ٹکے میں تبدیل ہو گیا۔ ریت سمندر نے سمٹ کر نخلستان کا روپ دھار لیا۔ سکون سے آنکھیں بند کیں اور اعصاب نے سرشاری کی دو آشتہ کا ایک اور گھونٹ بھرا جس کا وہ خاصی دیر تک آنند لیتا رہا۔

جب آنکھیں کھولیں تو دائیں جانب ایک بہت بڑا سیاہ بچھوڈنک کی زرد مالا کی قوس تلے اس کے وجود کا احساس کئے بغیر ہموار

رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں ڈنک کے زہر بھرے موتیوں کو چکار رہی تھیں۔ اس نے سوئی کی نوک جیسا ڈنک دیکھا تو خوف سے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔ لمحہ بھر کو اسے اپنے جوتے سے مسل دینے کا سوچا۔ پھر خیال آیا، میں اب انسانوں کی بستی سے نکل آیا ہوں جہاں بلا وجہ ہی دوسرے کو ضرر پہنچایا جاتا ہے۔ یہ صحرا ہے جس کی وسعت اپنے ہی قوانین کی حامل ہے۔ یہ بچھو مجھے کچھ نہیں کہہ رہا تو مجھے اس کا سفر کھونا کرنے کی کیا ضرورت؟

اس بڑے بچھو کے پیچھے پیچھے قطار میں پانچ چھ چھوٹے چھوٹے بچھو بھی جاتے نظر آئے، اپنے زہر کے بوجھ تلے دبے سانولے سے چھوٹے چھوٹے بچے، جو اگر بچھو نہ ہوتے تو خاصے پیارے ہوتے۔ وہ مسحور سا اس زہر بھری قطار کو دیکھتا رہا۔ غالباً قریب ہی ان کا ٹھکانہ ہوگا اور اب یہ شام کے استقبال کو نکلے ہیں۔ سب یکساں رفتار سے چلتے چلتے اس کی ٹانگ کے قریب سے گزرتے گئے۔ نہ انہوں نے اس کے وجود کو محسوس کیا اور نہ ہی اس نے ٹانگ ہلانے کی ضرورت محسوس کی البتہ ان کی موجودگی کے باعث اس نے کھلے میں رات بسر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا کہ نہ جانے یہاں اور کیا کچھ ہو؟

ٹھکانے کی تلاش میں ریت سمندر کی لہروں میں نظریں غوطے لگا رہی تھیں کہ دور افق کے قریب ڈوبتے جہاز کے مستول کی مانند تپش کی لہروں پر ڈولتا سا مینار نظر آیا۔ آنکھیں مل کر دوبارہ دیکھا۔ مگر یہ وہاں نہ تھا۔ وہ لرزاں مینار قائم تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ یقیناً یہ مینار ہی تھا۔ مینار کا مطلب انسان نہ سہی مگر عافیت یقیناً تھا۔

کنواری ریت میں پاؤں دھنستے جا رہے تھے۔ ریت لہریں لپٹ رہی تھیں اور باریک ریت کے ملائم ذرات جوتوں میں گھس کر پاؤں کی تھکن اور جلن میں اضافے کا باعث بن رہے تھے۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں یہ بھی ریت کے عجوبوں میں سے نہ ہو، مگر نہیں! سرخ ریت کے لہریں سمندر میں دور ہونے کے باوجود بھی قریب محسوس ہو رہا تھا۔ انگلی جیسا مینار لرزتا مگر مستحکم! گردن موڑی تو قدموں کے نشانات کو تعاقب میں پایا، بچھوؤں کا کنبہ ریت کی کسی لہر میں روپوش ہو چکا تھا۔

سورج غروب ہونے کو تھا۔ شفق اور ریت کی سرخی ہم رنگ تھیں۔ چنگاریوں سے دامن صحرا بھرا تھا اور سراب پانی کی بجائے آگ کے دریا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ سرخ آسمان اور سرخ صحرا درگزر سامنے سرخ ریت دریا کی سرخی میں موجیں، یا منظر العجائب، وہ مسحور سا کھڑا رہ گیا۔ سرخ رنگ شراب میں تبدیل ہو کر اعصاب میں عجب نشہ پیدا کر رہا تھا۔ غروب ہوتے آفتاب کے باعث تمازت میں کمی آچکی تھی اور خنک ہوا گرم جسم کو نرم پوروں سے سہلا رہی تھی۔ اس نے طویل سانس لے کر ہوا پھینچڑوں میں بھری اور جب اسے آہستہ آہستہ خارج کیا تو تھکن کو بھی ساتھ ہی جسم سے خارج ہوتا محسوس کیا۔

مینار کے سامنے پہنچا تو ریت کے سرخ تھال میں سورج کا انگارہ دھرا تھا۔ قریب اتنا کہ چھو کر دیکھ لو دور اتنا کہ پیش محسوس نہ ہو۔ سرخ پس منظر میں البتہ وہ سیاہ مینار اوپر آسمان میں مدغم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ صحرا میں یہ مینار کیسے، کس نے ایسا تہ کیا؟ موسموں کی مار سے بدرنگ مینار عجیب سا تھا۔ گویا ریت مجسم ہو گئی ہو۔ تجسس سے بھرا وہ قدم قدم مینار کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ چوٹی دروازے کے سامنے تھا جس کے ابھرے نقوش کی درزوں میں ریت بھری تھی۔ ہوا کے جھونکے نے دروازے پر دستک دی تو چرچاہٹ کے بعد کواڑوں نے گویا اس کے استقبال کو بازو پھیلا دیئے۔ وہ خوفزدہ تو نہ تھا، مگر جھجکا سا تھا۔ یقیناً یہ سراب نہ تھا مگر دل ایک لمحے کو ٹھنکا، پھر دھڑکن کی مالا سنبھال لی۔

اندر داخل ہو کر بدرنگ نگلی فرش کے دائرہ کومردہ پرندوں کے خشک جسموں، پروں اور بیٹ سے پر پایا تو فضا کو ان کے تعفن سے بوجھل بوجھل۔ آنکھیں اٹھائیں تو سانپ کی مانند بل کھاتے نگلی زینے کے ساتھ ساتھ بل کھاتی چلی گئیں حتیٰ کہ آسمان کے نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔

جسم میں خوف کی لہر نے حکم دیا۔ ”بھاگ جاؤ“

وہ متذبذب کھڑا رہا، مگر جب گھبرا کر باہر نکلا تو افق کی آگ میں اترتی سورج کی قاش کی سرخی آنکھوں میں اترتی محسوس کی۔ ایک نظر مینار کو دیکھا جو گلے ملتی سرخی اور سیاہی میں شب ب سری کے لئے واحد پناہ گاہ تھا۔ دوبارہ اندر آیا تو بدبو کی کوفت پر پناہ کے احساس کو حاوی کرنے کی کوشش کی۔

زینے پر پہلا قدم رکھا، پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ گرمی، جس اور تعفن! پسینے سے شرابور ہو کر اوپر دیکھا، مگر اب آسمان کا نقطہ سیاہ رات کی عبارت کا حصہ بن چکا تھا۔ اوپر نیچے دائیں بائیں گھور اندھیرا، ایسا اندھیرا کہ سمت کا احساس نہ رہے۔ اسے صرف یہ شعور تھا کہ اب اسے صرف اوپر ہی جانا ہے، اگرچہ اسے اوپر جانا زینہ بھی نیچے لے جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کے سہارے اور تقویت کے لئے مینار کی دیوار مضبوطی سے تھام لی تو بائیں ہاتھ کو خلا میں پایا اور تب اسے احساس ہوا کہ اس جانب سہارا لینے کو کچھ بھی نہ تھا۔ اوپر گردن اٹھائی مگر کچھ بھی نہ دیکھ پایا۔ وہ خلا میں ہے کہ پاتال میں؟ شاید وہ الٹا سفر کر رہا ہے اور اوپر جانے کی بجائے نیچے دھرتی کی ناف میں اترتا جا رہا تھا۔ دہشت کا نادیہ ہاتھ دل کو مٹھی میں جکڑے مسلے جا رہا تھا۔ رک کر منتشر سانسوں کو بالترتیب کیا۔ ماتھے کا پسینہ پونچھنے کو دیوار سے ہاتھ اٹھایا تو لوگا، ڈول کے نیچے جا گرے گا۔ وہ خود کو خلا میں راہنما ستارے کے بغیر محسوس کر رہا تھا، مگر قدم اٹھاتا چلا گیا۔ وقت تھم گیا تھا کہ سانسوں کی شوک میں تبدیل ہو گیا تھا، کچھ اندازہ نہ تھا۔ بس یہی احساس تھا کہ اگر دائیں ہاتھ کا دیوار کے لمس

سے تعلق منقطع ہو گیا تو خیر نہیں۔ دہشت اعصاب کو فرار پر مجبور کر رہی تھی مگر اب واپسی محال تھی کہ سہارے کے لئے بائیں ہاتھ کی جانب کچھ بھی نہ تھا بلکہ یہ اندیشہ بڑھتا جا رہا تھا کہ اگلا قدم کہیں خلا میں نہ اتار دے۔ سودیوار کے ساتھ چپکا، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گیا۔ ہر قدم کے ساتھ دل کی دھڑکن میں بھونچال سا آ جاتا، مگر جب اٹھا قدم زینے ہی پر پڑتا تو قرار کا لمحہ بے پایاں محسوس ہوتا حتیٰ کہ پھر اگلا قدم اٹھانے کی اذیت!

مینار پر پہنچا تو پسینے میں بھیگے دھونکی بنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر خود کو پرسکون بنانے کی کوشش کی۔ ابتدائی تاریخ کے چاند کی دھواں دھواں چاندنی میں کھلے آسمان تلے خود کو ایک تنگ حصار میں پایا۔ اتنی تنگ جگہ کہ بمشکل دو آدمی کھڑے ہو سکیں۔ چاروں طرف اونچی منڈیروں پر گدھوں کے سنگی مجسمے اوگتھے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید یہ بارہ تھے یا تیرہ۔ اسے ان کی تعداد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ منڈیر سے نیچے جھانکا تو محسوس ہوا گویا تاریک ریت سمندر اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے، سرگوشیوں میں پاس آنے کو کہہ رہا ہے، وہ چکر اگیا، سہارا لینے کے لئے اس نے سنگی گدھ پر ہاتھ رکھ دیا مگر فوراً گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا جیسے اس نے انگارہ چھو لیا۔ سنگی گدھ کا جسم گرم تھا۔

خوف سے اس کے سارے جسم میں کپکپی کی لہری دوڑ گئی۔ یا مظہر العجائب! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سنگی گدھ میں زندگی کی حرارت کہاں سے آگئی؟ یقیناً وہ اس فضا کے زیر اثر خوفزدہ ہو رہا ہے۔ اپنے دل کو اطمینان دلانے کے لئے اسے دوبارہ چھوا تو گدھ کو پر جھٹکتے پایا۔ تب مدہم اجالے نے اسے یہ دکھایا کہ دوسرا گدھ پنجوں پر رگڑ رگڑ کر چونچ صاف کر رہا ہے اور پھر اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے دیکھا کہ تیسرا گدھ غلیظ آنکھوں پر سے بھاری پہوٹے اٹھا کر اس کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے چیخنے کو منہ کھولا مگر خوف سے خشک حلق میں چیخ نے دم توڑ دیا۔ تمام گدھ بڑے بڑے پر پھڑ پھڑاتے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کی چونچیں کھلی تھیں اور آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی پوری قوت جمع کر کے چیخنا چاہا، منہ کھولا مگر اب وہ ان کے دائرے میں محبوس تھا، یوں کہ اس کا سارا جسم گدھوں کے پروں میں چھپ گیا۔ اس نے پوری قوت سے کام لے کر ان کے متعفن جسموں کو خود سے ہٹایا اور ایک بھرپور جست لگا، ایسی پرتوانا جست جو اسے باہر لے گئی۔ اور جب وہ نیچے گرا تو پچھوؤں کا کنبہ وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔



کاجل بن

سیاہ آسمان تلے آباد کاجل بن جیسا سیاہ پھنکارنا بن دھرتی پر نہ ملے اشجار وہاں کے آپ اپنی مثال کا لے ناگوں جیسی شاخوں پر زنگی کی ہتھیلیوں جیسے سیاہ پات، کسی اور بن کے شجر کی ڈالیوں پر نہ لہرا سکیں اشجار سبز کے برعکس سیاہ دل رقیب کی مانند دھرتی وہاں کی سیاہ گنہگار کے اردوں جیسی۔ مردہ لاوے جیسی سیاہ زمین پر جل بجھے کوئلوں جیسے سیاہ پتھر۔ فضا دھواں دیتی محسوس ہوتی، ہوا میں کالی ناگن کی شوک۔ کاجل بن کے درختوں شاخوں اور پتوں کو سر سیاہ رکھنے والا آب سیاہ دور کوہ سیاہ کی کالی برف کا قلب سیاہ چیز کو برآمد ہوتا، چہار سو سیاہی بکھیرتا، سیاہ دھرتی پر آباد اسی کاجل بن کے لئے سیاہ تراوٹ مہیا کرتا۔ مردہ جسم کے بالوں جیسی سیاہ بیلین، سیاہ تنوں سے لپٹی آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتیں، سیاہ جھاڑیوں پر کھلنے والے سیاہ پھولوں کی کڑوی مہک کیسی ہو سکتی تھی اس کا کوئی اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ کسی انسان کی مجال نہ تھی وہاں قدم دھرنے کی انسان تو کجا، دوسرے جانور اور پکھیر بھی وہاں زیست نہ کر سکتے تھے۔ گھنگھور اندھیرا ایسا کہ سیاہ رنگ راہ بھولے، چمگاڈڑاڑنے نہ پائے اور الودیدے نچا تارہ جائے۔

کاجل بن کوؤں کا دیس تھا جو کاجل بن میں سیاہ حسن کا مکمل نمونہ اور سانپ، چمگاڈڑا اور الو کے مقابلہ میں ارفع مخلوق تھے۔ کاجل بن کے یہ بے فکرے سیاہ ڈالیوں کے سیاہ پتوں میں بسر کر تے، سیاہ تنوں سے لپٹی سیاہ بیلوں کا جھولا جھولتے، جھاڑیوں کے سیاہ پھولوں کو دیکھ دیکھ نہال ہوتے، سیاہ شوکتی ہوا میں خوشی خوشی اڑتے۔ دھواں دھواں فضا میں ملفوف کاجل بن سیاہ آسمان تلے کوؤں کے لئے عافیت کا جزیرہ تھا۔ وہیں مدام قیام تھا، وہیں پیدا ہوتے، زندگی بسر کرتے، مرتے اور سیاہ زمین کے لئے رزق سیاہ مہیا کرتے۔ سیاہ اشجار کے لئے سیاہ کھاد بنتے اور پھر سیاہ اشجار کی جون میں نیا جنم لیتے۔ سیاہ ڈالیوں، سیاہ پتوں اور سیاہ پھولوں کے روپ میں۔ کوئے کثیر تعداد میں تھے وہ ہر وقت بولتے رہتے، بولتے رہتے، بولتے رہتے، بولتے رہتے، اور بولتے ہی رہتے۔ مسلسل بولنا ان کی مجبوری تھی کہ وہ اپنی ہی آواز پر فدا تھے۔ لہذا اپنی آواز سننے کی خاطر ہر وقت بولنے پر مجبور تھے۔

ان کی دانست میں ان کا کاجل بن دنیا کا حسین ترین بن تھا، ان کے سیاہ گھونسلے منفرد تھے اور خود ان کا وجود یکتا تھا۔ انہیں خوراک کی کمی نہ تھی، کاجل بن میں سیاہ پھولوں کے افراط تھی۔ اس لئے وہ شکم سیر ہو کر بولنا شروع کر دیتے، کیونکہ ہر وقت شکم سیر رہتے تھے اس لئے ہر وقت ہی بولتے رہتے۔ بولنا مجبوری بھی تھی، ضرورت بھی اور اپنی موجودگی کا احساس کرانے کا واحد ذریعہ بھی۔ ہر کو

اپنے وجود کو کا جل بن کا جل مرکز محور گردانتا اور اپنی آواز کو گری محفل کا باعث تصور کرتا۔ لہذا ہر وقت چوچ کھلی رکھے آواز کے شعلے کو لپکاتا رہتا۔ کوئی کسی کی نہ سنتا، ہر کو اپنی آواز کی بین پر مست بولتا رہتا، یہ جانے بنا کہ وہ کیوں بول رہا ہے۔ زیادہ جوش میں آتے تو چلانے لگتے، کبھی دوسرے پر، کبھی یوں ہی بلا وجہ اندر کا جوش ٹھنڈا کرنے کو۔

الغرض! ہر کو ایوں ہی بولتا رہتا، بولتا رہتا، چلاتا رہتا، چلاتا رہتا۔ حتیٰ کہ سیاہ حلق دکھنے لگتے۔ تب وہ شکم سیری میں جت جاتے اور تازہ دم ہوتے ہی سیاہ چوچ خود بخود کھل جاتی جس میں سے کرخت آواز کا سیاہ جھرنّا پھوٹ بہتا۔ یوں گھنگھور کا جل بن کوؤں کی آوازوں سے ہر وقت گونجتا رہتا۔

ہر کو خود کو کا جل بن کی حسین ترین، ذہین ترین اور اسی لئے ارفع ترین مخلوق سمجھتا، وہ سیاہ اشجار کی سیاہ ڈالیوں میں اپنے سیاہ گھونسلے کو مرکز کائنات گردانتا، اسی لئے اپنے شجر، اپنے گھونسلے اور اپنے وجود کے علاوہ اور کسی شجر، گھونسلے اور وجود کو تسلیم نہ کرتا کہ اکمل ترین کوئے کی ارفع ترین مثال تو وہ خود ہی تھا لہذا اپنا وجود منوانے اور دوسرے وجود کی نفی کے لئے وہ ہر وقت بولنے کو مستعد رہتا، اسی لئے کا جل بن میں زبان سب سے زیادہ بڑا آلہ اور موثر ہتھیار تھی جس سے کام لینے کے ڈھب سے بھی صحیح معنوں میں وہی آگاہ تھے۔ آگاہ کیا؟ وہ تو ماہر زبان اور قادر الکلام بھی کہے جاسکتے تھے کہ ہر کو، دوسرے کوئے کے مقابلہ میں غنچہ دہن، شیریں مقال اور نے نواز تھا۔ ہر کو اس اہم آلہ اور ہتھیار کی ہمہ وقت حفاظت کرتا، ایسی حفاظت گویا اسی پر اس کی زندگی کا دار و مدار اور بقا کا انحصار ہو۔ دراصل ان کا ایک دوسرے پر چلانا اور پھر اپنے لئے چلانا ہی مقصود حیات تھا کہ یوں تن سیاہ میں سیاہ خون موجزن رہتا، گرم رہتا، ابلتا رہتا اور لاوے کی مانند کھولتا رہتا جس سے ان کی سیاہ آنکھوں میں چمک اور سیاہ حلق میں تراوٹ رہتی۔ ان میں سے جو بہت ہی پہنچے ہوئے کوئے تھے انہوں نے اپنی آواز کو انداز عافیت، شعار زیست، وظیفہ حیات اور شعور و فکر میں تبدیل کر لیا تھا جبکہ بعض کے لئے زبان جائے امان اور قلعہ کی صورت اختیار کر چکی تھی، یوں وہ آواز کے قلعہ میں، آواز کی فصیل کی آڑ میں، آواز کے ہتھیار سے ناپسندیدہ کوؤں اور ناپسندیدہ تو سبھی تھے، کے بننے ادھیڑتے رہتے۔

کا جل بن کی تاریک پر شور فضا میں بقیہ جاندار آسودگی سے نہ رہ سکتے تھے اس لئے ایک ایک کر کے سب نے ہجرت اختیار کی۔ پر بہار جنگلوں کو جہاں اشجار میں زمردیں ہریالی تھی آسمان میں فیروزہ جیسی ٹپٹپیں چمک اور ہرے پات کی آغوش میں آسودہ قطرہ شبنم میں موتی کی دمک۔ پرندوں نے ایسے جنگلوں کا رخ کیا جہاں شفاف پانی کی اجلی لہروں سے جب دھوپ آنکھ مچولی کھیلتی تو قطرہ آب میں دھنک کا آنچل لہراتا۔ جانور ایسے مہکتے بنوں کے سدھارے جہاں دن کو موتیا مہکتی سانس لیتا تو رات کی رانی تاروں بھری رات پر حکمرانی کرتی۔ انہوں نے ان خطوں کا رخ کیا جہاں سرخ گلابوں کے انگارے دکھتے کنول، ہوا سے خوشبو کی حکایات سنتے اور

تئلیاں بصورت قاصد پھول پھول پیام صبا لے جاتیں۔ الغرض سب نے رخ کیا دو دھیا چاندنی والے جنگلوں کا خوشبو سے جھولیاں بھرے جنگلوں کا صبح کو گنگنائی ہو اوالے جنگلوں کا اور باقی بچے کون؟ ماریاہ شوکتی کالی ناگئیں کا لے پھوجن کے ڈنگ میں سیاہ رنگ کے موتی چمکتے سیاہ لمبے کھجورے یہ زمین پر اور اشجار پر کوئے کوئے ہی کوئے چیتھتے چلاتے خالص کوئے اور پھر ایک دن!

یہ عجیب وقوعہ تھا اس لئے پراسرار تحیر خیز اور خوفناک بھی تھا کہ ایسا آج تک نہ ہوا تھا۔ معمول کی ایک سیاہ صبح جب کوئے بیداری کے بعد معمول کے مطابق آواز کی دھارتیز کرنے کی اہم ترین فریضہ کی ادائیگی میں محو تھے کہ اچانک ہی کا جل بن کے قلب میں رنگوں کی ایسی تنویر دکھائی دی کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ گھنگھور کا جل بن کی یہ مخلوق صرف سیاہ رنگ کی خوگر تھی لہذا آنکھیں صرف سیاہی کو برداشت کر پاتیں۔ مگر اس پیکر عجب میں ایسے رنگ تھے جو ان کی آنکھوں کی سیاہ پتلیوں میں بسی تاریکی کو گزند پہنچا رہے تھے۔ ایسے رنگ جو احاطہ تصور میں نہ لائے جاسکتے ایسے رنگ جن کا ادراک تخیل سے بھی بعید تھا۔ یہ کیا ہے؟ یہ کون ہے؟ رنگوں کا یہ چستکار کیونکہ سمجھ میں نہ آ رہا تھا اس لئے یہ بن بلائے ناگہانی تھی یہ بلائے جان اور بربادی کا سامان تھی۔ شاید یہ دوسرے کوؤں کی غلط کاریوں کی سزا کے لئے بھیجی گئی تھی۔ شاید نہیں یقیناً یہ دوسروں کی بد اعمالیوں کی وجہ سے یہاں اتاری گئی۔ سزا عقوبت عذاب!

کبھی کوئے سیاہ چونچیں کھولے گول گول سیاہ دیدے چکائے اس پیکر تحیر کے گرد گھیرا باندھے تھے کچھ کھڑے کچھ پر پھڑ پھڑاتے کچھ ساکت بعض اوپر درختوں پر براجمان آنکھیں ملتے مرکز نگاہ طلسمی پیکر تھا جو دید میں نہ تھا نہ شنید میں۔ سب خاموش کہ حیرت سے گنگ تھے۔ اچانک خاموشی کی وجہ سے آوازوں بھرا کا جل بن اب ڈراؤنا بن گیا اتنا کہ وہ خود بھی اپنی خاموشی سے ہراساں ہراساں ہو گئے۔

پیکر عجب بولا تو اس کی آواز کی نرمی اور لہجہ کی نغمگی کرخت آوازوں کے خوگر کانوں کو تکلیف دہ حد تک ناگوار تھی۔ کیسی غیر موثر آواز ہے اس کی انہوں نے پریشان ہو کر سوچا۔ جیسا منحوس پیکر ویسی ہی نحوست بھری آواز۔ جیسے خوفناک رنگ وجود کے ویسی ہی بھیا تک آواز۔ مردہ مردہ سی کسی جلتی سی شے جیسی۔ ایسی آواز والی مخلوق سے کار خیر کی توقع عبث ہے۔

پیکر رنگ و بو انہیں اپنے خوش منظر جنگل کے بارے میں بتا رہا تھا کالے کوؤں کو سفید سرخ سبز نیلے رنگوں کی کتھاسنا رہا تھا۔ ان رنگوں کے حسن سے آگاہ کر رہا تھا جو انہوں نے کبھی دیکھے ہی نہ تھے۔ اس آب مصفا کا احوال سنار ہا تھا جس پر چمکیلی دھوپ سنہری لہرائی کی چادر بچھا دیتی مگر کالے کوؤں کا مسئلہ یہ تھا کہ انہوں نے تو کبھی ایسا پانی چمکیلی دھوپ اور اس سے منور قطرہ آب بھی نہ دیکھا تھا وہ بھلا کیسے باور کر سکتے تھے۔ نادیدہ کا اعتبار مشکل تھا۔ یہ جھوٹ تھا آسمان سیاہ کے علاوہ اور بھلا کس رنگ کا ہو سکتا تھا۔ یہ مکار وجود بے سرو پا باتوں سے انہیں بیوقوف بنا رہا تھا اس فریبی کا سب سے بڑا جھوٹ تو جنگلوں کے بارے میں تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ

ایک حقیر کیڑا اڑے بھی اور چمکے بھی۔ اور وہ بھی رات کو۔ ناممکن، لغو، جھوٹ، فریب، حماقت!

جیسے جیسے ہی اس پیکر عجیب اور وجود پر فریب کے بارے میں ان کا تجسس کم ہوتا گیا، اس کرپرسوں داستان طرازی کی قلعی بھی اترتی گئی حتیٰ کہ وہ گیت گاتے پرندوں، تالیاں بجاتے پتوں، رنگوں کی جوالا خوشبو کی آبخار دھنک کے آنچل، شفق کی شرم اور بڑکی شانت چھاؤں جیسی لغویات کی تاب نہ لاسکے اور جھوٹ کی اس پوٹ پر حملہ آور ہو گئے۔ اپنی آوازوں سے، صرف اپنی آوازوں سے محض اپنی آوازوں سے۔ ہر چند کہ اس پیکر عجیب نے خوش آہنگ لہجہ اور شیریں لُحْن میں اپنے صادق ہونے کا یقین دلایا مگر وہ کرخت آوازوں کی کنار یوں، برچھیوں اور تیغوں سے ذبح کر دیا گیا۔ اس کی خوش رنگ لاش کے گرد گھیرا بنائے، نفرت، حقارت، غیض، غضب اور خشونت کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے اور بول رہے تھے، چیخ رہے تھے چلا رہے تھے مگر اس جھوٹے کو مار کر بھی دل نہ بھرا، جوش سرد نہ ہوا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس طیش عظیم سے محض ایک دوسرے پر چلا کر بھی وہ سکون پذیر نہ ہوں گے۔ اب کیا کریں؟

تب ایک سیانے کو نے اس جھوٹے جنگل کا رخ کرنے کا مشورہ دیا جہاں کے سانپ رنگین اور رات کو اڑنے والے کیڑے روشنی بکھیرتے تھے۔

کوؤں کا جھنڈ کیا اڑا، پر شور خشونت بھری گھنگھور گھٹا اڑی۔ لیکن پیکر رنگ و بو جھوٹا نہ ثابت ہوا، اس کا جنگل واقعی کا جل بن کے برعکس رنگ بن تھا۔ اڑتے جگنوؤں کی جلتی مشعلوں سے جنگل میں تاروں بھرا آسمان اتر آیا تھا۔ یا مظہر العجائب! یہ طلسم ہوشربا کا ہے کو دیکھا تھا۔ وہ ہوا ہی میں ٹھٹھک کر یوں ساکت ہوئے کہ پر ہلانا بھول گئے۔ پر غضب گھٹا لمحہ بھر کو ساکت گھٹا میں تبدیل ہو گئی، لیکن صرف لمحہ بھر کو۔ اس کے بعد قہر کی گھٹا میں!

وہ کھلی چونچوں سے روشن اور میکتے جنگل پر حملہ آور ہوئے اور آنکھوں میں سوئیوں کی مانند چبھنے والے جگنوؤں کو نگلنا شروع کر دیا۔ کوئے رات بھر مصروف رہے اور پو پھٹنے تک وہ روشن بن کو تاریک بن میں تبدیل کر چکے تھے۔

شاداں و فرحاں چیختے چلاتے انہوں نے واپسی کا سفر طے کیا، وہ جلد سے جلد اپنی تاریک عافیت میں پہنچنا چاہتے تھے۔ انہیں باہر کی ہوا، فضا، رنگ، روشنی، نغمہ خوش نہ آتا تھا۔ لہذا فتح کے شور میں مگن اڑے جا رہے تھے اور بالاخر جب اپنے کا جل بن میں جا پہنچے تو مزید چلا چلا کر خوشی اطمینان اور اور فتح کا اعلان کیا۔ مگر یہ کیا؟

تاریک باطن میں روشنی لئے ہر کو جگنو بنا چمک رہا تھا۔ کا جل بن، جگنو بن میں تبدیل ہو چکا تھا۔



شجر سنگ بار

ہریالی کا آچل لئے، خوش قبائستی، نازنین کی مانند خوش رنگ پھولوں کا سنگھار کئے رہتی، چمکیلی دھوپ میں لٹ لٹ کر تکی سنہری جھیل جھومر کا کام کرتی، نرم گام ہوا، پھولوں کی مہک سے جھولیاں بھر بھر لاتی اور بستی پر خوشبو کی رم جھم رم جھم ہوتی رہتی۔ گجر دم کھرے کی چادر سر کا کے آفتاب بستی کے حسن کو مسکرا مسکرا کر سلام کرتا، دن بھر بستی پر دھوپ کی گاگرانڈیلتا، ایسی دھوپ، اعصاب جس کا ذائقہ محسوس کر سکیں، شام ڈھلے دوسرے پر بت کی چوٹی پیچھے بسرام کرنے سے پہلے، افق پر پھیلی بدلیوں کو گلابی، آتش گلابی، سرخ، عنابی اور سنہری رنگوں کی چیزیاں پہناتی نہ بھولتا، بدلیاں نہ ہوتیں تو طشت افق لالہ کے پھولوں سے بھر جاتا۔

شاداب پر بت کی گود میں آباد نیلی جھیل کنارے آسودہ، گجرہ کی طرح گندھی اور مہک بھری بستی کے لوگ بھی صاف ہوا کی مانند صاف، شفاف جھیل کی مانند شفاف، قبائے گل جیسے سادہ اور اشجار پر نغمہ زن پرندوں جیسے معصوم تھے۔ کل نفوس باہمی اخوت سے زیست کرتے، خورد و بز رنگوں کا احترام لازم گردانتے اور بزرگ خوروں سے انس کا برتاؤ کرتے۔

بستی میں قانون سکھ رائج الوقت تھا۔ درجہ بدرجہ پیڑھی بہ پیڑھی، فرد بہ قانون نافذ تھا چنانچہ حاکم کے منہ سے نکلا ہر لفظ قانون، حاکم کے نائب کے منہ سے نکلا ہر لفظ قانون، حاکم کے نائبین کے اہلکاروں کے منہ سے نکلا ہر لفظ قانون، دادا کے منہ سے نکلا ہر لفظ پوتے کے لئے قانون، باپ کے منہ سے نکلا ہر لفظ بیٹے کے لئے قانون، بھائی کے منہ سے نکلا ہر لفظ بہن کے لئے قانون، خاوند کے منہ سے نکلا ہر لفظ بیوی کے لئے قانون۔ سبھی دائرہ قانون میں رہتے، کوئی حد سے نہ گزرتا، حد سے گزرنے کا کیا ایسا سوچا بھی نہ جاسکتا تھا۔

شرم و حیا عورتوں کا گہنا و عصمت و عفت تانگہ داؤں کا جوہر۔ آنکھیں بارحیا سے بو جھل، نہ ہنسی میں کھنک، نہ چال میں منک، نہ مکھ پر نکھار نہ تن میں ابھار نہ ادا نہ چمکا، نہ لپکا، تیز ہوا سے سر کا آچل نہ ڈھلکتا، سیدھے سبھاؤ والی یہ عورتیں کسں ہوتیں تو باپ کی خدمت کرتیں، بیاہی جاتیں تو ساس، سر کی تابعداری کرتیں، خاوندوں کی حکم عدولی کا تو سوچا بھی نہ جاسکتا تھا۔ اسی لئے عورتیں اس بستی کی بے مثال جانی جاتیں۔

مرد جب قانون کے دائرہ میں اور عورتیں اپنی اوقات میں رہیں تو پھر شر کا بیج کہاں سے پھوٹے گا؟ لاریب خوش منظر بستی روئے ارض کا خال تھی۔

بستی کے مرکز میں جو شجر تھا وہ عظیم بھی تھا اور قدیم بھی۔ پرکھوں کے تذکروں میں اس شجر کا تذکرہ بھی ملتا تھا ہر بوڑھے نے اس شجر کو بوڑھا ہی دیکھا تھا۔ مشروب کے پیالوں کے دور کے ساتھ تمباکو کے نیلگوں دھوئیں کے مرغولوں اور چہروں پر الاؤ کے ابھرتے ڈوبتے شعلوں کی چمکیلی دھاریوں میں جب رات گئے داستان گو داستان کا الاؤ روشن کرتا تو واقعات کی چنگاریاں سلگ اٹھتیں جری شہزادیوں اور ماہ جبین شہزادوں کے دلکش حسن کے تذکرہ سے سامعین کے چہروں پر چمک آ جاتی، مگر ہر داستان میں کسی نہ کسی طرح سے اس شجر عظیم و قدیم کا تذکرہ ضرور شامل ہوتا۔ کبھی شہزادہ کا فاتح لشکر اس کی فراخ چھتری تلے استراحت طلب ہوتا تو کبھی زہرہ جبین شہزادی کی برات! بعض داستانوں میں یہ بھوت بسیرا تھا تو بھی اس میں روپوش پچھل پائیاں خوبصورت نوجوان پر عاشق ہو کر انہیں اغوا کر کے لے جاتیں۔ عظمت، قدامت اور داستانوں کے تحیر کی وجہ سے اس شجر نے اچھی خاصی مافوق الفطرت حیثیت اختیار کر لی تھی۔ کئی عجیب و غریب واقعات اس شجر سے منسوب تھے تو متعدد انہونیاں اس کا چتکار سمجھی گئیں، کچھ کے لئے یہ شجر پراسرار تھا تو کچھ کے لئے زندہ پیکر، کبھی یہ دیوتاؤں کی تجسیم سمجھا گیا تو کبھی بذات خود دیوتا اسی لئے کسی بزرگ ہی کی مانند اس کا احترام کیا جاتا، گزرتے وقت بچے اسے سلام کرتے، شریر سے شریف بچہ بھی اس پر چڑھنے کی جرات نہ کر سکتا تھا، مرد دوست جان کر دل کے بھید اس کے سپرد کر دیتے، دکھیاریاں اس سے لپٹ کر روتیں جبکہ خوش و غرم عورتیں اس کی شاخوں پر رنگین آنچل باندھ دیتیں۔ یوں شجر پر ہر وقت رنگین آنچلوں کے پھول کھلے رہتے۔ اس کے باوجود شجر کی بلندی، چٹنگی اور پھیلاؤ مرعوب کن تھا، دور سے دیکھنے پر یوں محسوس ہوتا گویا کوئی مہیب طلسمی پرندہ سینہ زمین میں پنچے گاڑے، فراخ پر پھیلائے، زقند بھرنے کو تیار ہو۔ تنے کا پھیلاؤ اتنا کہ چار تو انا مرد بھی بازوؤں کے گھیرے میں نہ لے سکیں، اوپر نگاہ اٹھے تو کمزور چڑیا کی مانند نظر اوپر ہی اوپر اٹھتی جائے مگر چوٹی تک نہ پہنچ پائے۔ مضبوط طویل شاخوں کے گہرے سبز رنگ کے دبیز پتوں کی چھاؤں سورج میں خنک اور چاند میں ملائم ہو جاتی۔

شجر سانجھا تھا۔ دوست، بھائی، غمگسار، بزرگ کی مانند سب کے لئے بازو پھیلائے، اس کی چھتر چھاؤں میں سب کا فالو وقت گزرتا، مگنی شادی اور کاروبار کا معاملات طے پاتے، پنچایت ہوتی اور حاکم اس کے تنے سے ٹیک لگا کر سزا جزا کا فیصلہ کرتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ شجر شمس تھا اور نظام شمسی کی مانند بستی اور باسی اس کی کشش کے اسیر تھے تو اسے مبالغہ نہ جانا جائے۔

المختصر! پاک مردوں اور نیک عورتوں پر مشتمل خوش منظر بستی طمانیت سے لیل و نہار کر رہی تھی کہ انہونی ہو گئی۔ انہونی جیسی انہونی؟ ایک ناکندہ اپیٹ سے ہو گئی، بستی میں آج تک ایسا فعل بد نہ ہوا تھا کہ جس کے نتائج بدیوں اظہر من الشمس ہو جائیں۔ بستی کے معمر ترین مرد کی یادداشت تک میں کسی ایسے خوفناک واقعہ کی یاد محفوظ نہ تھی۔ اس زن ناہنجار کے کالے کرتوت سے بزرگ تھرائے، نہ جانے

اب کیا آفت ہم پر آئے ماؤں نے دہشت سے کلیجہ تھام لیا، باپوں نے سر پیٹ لئے اور کنواریاں نجل نجل! یقیناً یہ زن پلید ہم پر تباہی کا باعث بنے گی۔ اس ناشدنی کے باعث ہم ہلاکت کے گڑھے میں گریں گے۔ اس فعل قبیح کی سزا میں آسمان سے بجلیوں کی بارش ہو گی، یہ زن نابکار یہاں کا غلہ کھاتی تھی لہذا فعل حرام کے نتیجہ میں فصلیں جل جائیں گی، یہ بد بخت جھیل کے پانی سے غسل کرتی ہوگی اس لئے کوئی بعید نہیں کہ اس زن ناپاک کے جسم کی نجاست کی وجہ سے جھیل کا پانی ہی زہر آلود ہو جائے۔

زن بے مہار ہر حالت میں سزا سے بچنے نہ پائے۔ یہ اجتماعی بقا کا معاملہ تھا۔ انفرادی گناہ کی بات نہ تھی، یہ سزا سے بچ گئی تو دیکھا دیکھی یہ چلن بد عام ہوگا۔ بہو بیٹیاں بے لگام ہوں گی، عزتیں سرعام نیلام ہوں گی تو شرافت کے منہ پر کا لک مل دی جائے گی۔ گناہ کا پھل سستا ہوگا، نسلوں کی نسلیں پیدا ہوں گی۔ زنہار! بچ کے نہ جانے پائے۔

شجر عظیم و قدیم کے سایہ میں کارروائی کا آغاز ہوا تو زن فاحشہ کو دیکھنے کے لئے بستی کے بزرگوں، جوانوں، کنواریوں اور بوڑھیوں کا میلا لگ گیا۔ سب کی آنکھیں اسی پر مرکوز تھیں، بدکاری نے جس کو چہرہ کو گویا جلا بخشی تھی، وہ بے خوفی سے کسی فاتح کی مانند سینہ تانے کھڑی بے غیرتی کی آنکھوں سے دیکھنے والوں کو گھور رہی تھی، جس سے آنکھیں چار ہوتیں وہ گھبرا کر نظر جھکا لیتا۔ فعل بد کا ثبوت نمایاں تر تھا لہذا جرح کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے سکون سے فرد جرم سنی نہ گھبرائی، نہ گڑ گڑائی، نہ منت کی، نہ معافی مانگی، نہ رحم کی، بھیک مانگی، ہاں! شریک گناہ کا نام نہ بتایا۔ ماں باپ کی مار پیٹ بھی نام نہ اگلا، اسکی تھی جو چپ سادھی تو ہرگز نہ بولی۔ مختصر مقدمہ کے بعد مختصر ترین فیصلہ ”سنگساری“

سزا کا فیصلہ سن کر تماشا شائق عالم دہشت میں خود بخود پیچھے ہٹ گئے۔ وہ بے لباس کی گئی تو بیک وقت سب کی زبان سے نکلا ”اوہ“ شجر عظیم و قدیم کے سایہ میں تنہا کھڑی تھی اب وہ دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے کسی کی جستجو ہو جیسے ہی پہلا ہاتھ پہلا پتھر اٹھانے کو جھکا، مجمع میں سے آواز آئی۔ ”ٹھہرو“

سب نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا جس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی حرکت کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

”میں اس کا شریک ہوں“

وہ اسے دیکھ کر خوشی سے مسکرائی، سب اسے ٹکر ٹکر دیکھتے رہ گئے، وہ سر بلند کئے آگے بڑھتا گیا۔

”مارو اسے بھی مارو“

پتھروں کی بارش ہونے سے پہلے وہ اس کے پاس جا پہنچا اور پہلا پتھر آنے سے قبل ہی وہ اپنے جسم کو اس کے لئے لباس اور

ڈھال میں تبدیل کر چکا تھا۔

لوگ پر خشونت جانوروں میں تبدیل ہو چکے تھے، عالم وحشت میں ان کے ہاتھ چل رہے تھے اور عالم ہڈیاں میں زبائیں دونوں کی باہم پیوست، مسخ شدہ لاشیں ناقابل شناخت ہو گئیں تو مجمع کا جوش سرد ہوا سب نے بوجھل قدموں سے گھروں کا رخ کیا۔

عبرت کے لئے لاشیں شجر عظیم و قدیم کے قدموں ہی میں چھوڑ دی گئیں۔

اگلی صبح بستی میں پھر دہشت کی لہر دوڑ گئی۔

شجر عظیم و قدیم، بزرگ، دوست، بھائی اب شجر سنگ بار میں تبدیل ہو چکا تھا۔ تنہا شاخیں، ڈالیاں، پتے سب پتھر کے تھے۔ ہری بھری ٹھنڈی چھاؤں والا شجر زندہ شجر کے بجائے سنگی شجر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہوا کا جھونکا آتا تو گہرے سبز دبیز پتوں کے جھڑنے کے بجائے پتھر پڑتے!



پریاں قطار اندر قطار

روش کا موڑ کا نا تو نگاہ کی قوس کے کنارہ پر اسے پایا، سرخ پھولوں کے انگاروں میں نمکین پھول، وجود کی خوشبو میں گم، پیشانی پر انہماک کی شکن، دراز پلکوں کے سائے میں بادامی پپوٹے، چہرہ کی سانولی کتاب پر تل کا سیاہ نقطہ اور بیضوی ٹھوڑی میں چھوٹا سادارہ۔ مانند تصویر ساکت، صرف گردن تلے ابھاری میں سانس کی لرزش!

اسے دیکھ کر میں گویا پتھر کے مجسمہ میں تبدیل ہوا۔ صرف نظر کی تتلی اس کے ارد گرد منڈلاتی رہی۔ اس نے بے خیالی میں پھول کی جانب ہاتھ بڑھایا تو کانٹا چھبا، نیم والہ ہلکی سسکی میں کھل گئے۔ انگلی کی پور پر سرخ رنگ دمک رہا تھا۔ تصویر اور مجسمہ کی آنکھیں ملیں، برشگالی جنگل کی گہری سبزی والی آنکھیں مقناطیسی کی مانند مجھے کھینچ رہی تھیں۔ غیر مرئی ڈور سے بندھا میں قدم قدم بڑھتا گیا، آنکھوں کی بندکلیاں، تجس میں کھلیں، تو پھول بن گئیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو پور پر ایک اور عنابی موتی ابھر آیا۔ میں نے انگلی منہ میں لے لی، عجیب لذت تھی اس کے لبو میں میرے اعصاب جھوم اٹھے، گل چشم کھلتے گئے!

”اس کی ضرورت تو نہ تھی۔“ نرمی سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔ آواز کا شعلہ لپکا اور مجھے راکھ کر گیا۔ میں نے دوبارہ ہاتھ تھام لیا، نرم ہاتھ میں گرم لرزش۔۔۔

”اب کیوں؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”شاید اور عنابی موتی ہوں۔“

”عنابی موتی؟“

”ہاں! عنابی بھی اور میٹھے بھی۔“

”میٹھے! کیا مطلب؟“

”ہاں! ان عنابی موتیوں میں عجیب منہاس تھی، انوکھی، انجانی، لذیذ۔۔۔۔۔۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”میں بھی نہیں سمجھ پایا لیکن عجیب شیریں لذت ہے تمہارے خون میں۔“ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا، اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا میں نے اور مضبوطی سے تھام لیا، اس نے مزید زور لگایا۔

”چھوڑیے نا!“ حجاب سے آنکھوں کی سبزی گہری ہو گئی۔

”ہرگز نہیں۔“

”کیوں؟“

”مجھے تمہارے خون کی مٹھاس پسند ہے۔“

”تو؟“

”اب تم میری ہو۔“

وہ ہنسی۔ ”کیا تم ڈر کیولا ہو؟“ سبز رنگ میں شرارت کی چمک۔

”اے کاش ایسا ہی ہوتا۔“

”تو کیا کرتے؟“ سبز رنگ میں تحیر کا رنگ۔

”تمہارا سارا خون پی کر نہال ہو جاتا۔“

”ہائے اللہ!“ سبز رنگ میں دلربائی کا رنگ۔ ”کتنے برے ہو۔“

”نہیں! میں تو بہت اچھا ہوں۔“

”تو یہ ڈرانے والی باتیں کیوں؟“ سبز رنگ میں ادا کا رنگ۔

”میں ڈر نہیں رہا، واقعی تمہارا خون مٹھاس بھرا ہے۔“

بارانی جنگلوں پر سبزی مستقل لہرا رہی تھی۔

ہم دونوں خاموش تھے۔ میں نے ابھی تک ہاتھ تھام رکھا تھا، اسے اور قریب کر لیتا ہوں۔ ”میری بنوگی۔“

جھکی آنکھیں اٹھتی ہیں، سبز رنگ میں انہوں نے رنگوں کی جوا لاتی تھی۔ میری نظروں کا پروانہ رنگوں کی جوا ل میں بھسم ہونے کو تیار۔

میرا دل اس کی دھڑکن پر دھمال ڈال رہا تھا کہ اس کا دل میری دھڑکن پر مدغم ہو چکا تھا؟ کچھ پتہ نہ تھا، خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا۔

”میری بن جاؤ۔“

”تمہاری ہی تو ہوں۔“

”صحیح معنوں میں۔“

”کیا مطلب؟“

”ہر لحاظ سے۔“

”ہر لحاظ سے ہی تو ہوں تمہاری۔“

”نہیں..... قطعی طور پر۔“

”قطعی طور پر؟“ وہ نہ سمجھتے ہوئے دہرائی ہے۔

”ہاں! غیر مشروط طور پر۔“

”غیر مشروط طور پر؟ میں کچھ نہیں سمجھی۔“

”ہر لحاظ سے مکمل طور پر۔“

”ہر لحاظ سے ہی تو تمہاری ہوں۔“

”نہیں ہر لحاظ سے نہیں ہو۔“

”میں تو یہی سمجھتی ہوں۔“

”بس اس طرح میری بن جاؤ کہ اور کسی کی نہ بن سکو۔“

”گویا میری وفا پر شک ہے؟“

”نہیں تو۔“

”پھر یہ کیا کہہ رہے ہو۔“

”بس میں چاہتا ہوں کہ تم مکمل طور پر میری بن جاؤ۔“

”اوہو۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔ ”میں کچھ نہیں سمجھی۔“

”میں سمجھاتا ہوں وفا کے امتحان کے لئے۔“ اور میں اسے اولین قطعی شرط بتاتا ہوں.... حیرت سے ہزرنگ سبز تر ہوتا گیا۔

”کیا کہہ رہے ہو..... بوتل میں؟ آج تک کوئی عورت بوتل میں بند ہوئی ہے؟“

”عورت شاید نہیں مگر بیوی یقیناً!“

”خاوند کی خوشنودی کے لئے؟“

”نہیں! خاوند کی محبت کے لئے۔“

”تو یہ تمہاری شرط ہے۔“

”ہرگز نہیں۔“

”تو پھر؟“

”محبت میں یہ تمہارا تحفہ ہوگا میرے لئے۔“

”مگر میں بوتل میں کیسے رہ سکتی ہوں، چھوٹی سی بوتل اور میں اتنی بڑی۔“ ”سچی محبت ہو تو نہ بوتل چھوٹی رہتی ہے اور نہ عورت بڑی“

محبت کی طاقت سے سب کچھ ممکن ہے۔“

وہ بدھا میں مجھے تک رہی ہے۔

”میرا تمہارے لئے میری سچی محبت، تم سے میرا اتھاہ عشق، تمہیں اور بوتل کو ایک کر دے گا۔ یوں کہ دوئی شائبہ بھی نہ رہے گا۔“

”دوئی کا شائبہ بھی نہ رہے گا۔“ وہ میرے الفاظ آہستہ آہستہ دہرا رہی ہے۔ جیسے ان کا ذائقہ محسوس کر رہی ہو، پھر پوچھتی ہے۔

”ہم تم ایک ہوں گے؟“

”تم اور بوتل ایک ہو گے۔“ میں تصحیح کرتا ہوں۔

”تم نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔“

”الجھن کیسی“ میں اسے سمجھاتا ہوں۔ ”تم مجھ سے محبت کرتی ہونا؟“

”ہاں۔“

”میری بیوی بننا چاہتی ہوناں!“

”ہاں۔“

”بس! پھر کیسی الجھن..... تم شیش محل کی رانی ہوگی۔“

”شیشے کا محل۔“

”ہاں! خوبصورت بوتل۔“

”بوتل میں گھٹن نہ ہوگی؟“

”نہیں! میرا پیارا اس کا احساس نہ ہونے دے گا۔“

”میری سانس بھی تو رک سکتی ہے؟“

”نہیں! میرا پیارا یہ نہ ہونے دے گا۔“

”اور اگر موت آئی تو.....؟“

”نہیں! میرا پیارا تمہیں امر بنا چکا ہوگا۔“

وہ سر جھکائے غور کرتی ہے۔ تب پوری آنکھیں کھول کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فیصلہ سنا دیتی ہے۔ ”ٹھیک ہے۔“

سبز آنکھوں میں محبت کا سبز رنگ دمک رہا ہے۔

”اوہ! میری جان۔“ میں خوشی سے اسے ساتھ لپٹا لیتا ہوں۔ ”تم نے آج محبت اور وفا کا لافانی ثبوت دے دیا، عورت کا نام

زندہ کر دیا۔“

مجھے خوش دیکھ کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔

میرے پیار کے چہکار سے وہ بوتل میں تھی..... شیش محل کی پری، سبز آنکھوں والی پری، ننھی منی سی سانولی پری، شفاف شیشے

میں، میں فخر و انبساط کے ملے جلے احساسات سے دیر تک اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ وہ شرما کر نظریں جھکا لیتی ہے۔ چہرہ کے نمک میں

سرخی گھل جاتی ہے۔“

میں احتیاط سے بوتل اٹھا لیتا ہوں، جس کا اس کے جسم کے باوجود پانچ پھولوں سے زیادہ وزن نہیں۔ میں الماری میں قفل کھولتا

ہوں۔ خوبصورت اور خوش رنگ بوتلوں سے بھری الماری۔ ہر بوتل میں ایک سے ایک بڑھ کر نازنین، مہ جبین، ناز آفرین، گل بدن،

سفید رنگ میں صبح کا اجالا، سنہری بالوں میں سونے کی آبتار، دراز زلفوں میں شب تاریک، سیاں آنکھوں میں کالا جادو، کمر کے خم میں

شاخ گل کی لچک، حنائی پوروں میں خون جگر، میرے پاس سانولے چہرہ سبز آنکھوں والی نہ تھی، تکمیل کا احساس بھی عجیب طمانیت بخش

ہوتا ہے۔

مجھے دیکھ کر وہ سب اظہار مسرت کرتیں اور خیر مقدمی انداز میں ہاتھ ہلاتیں۔ میں بھی والہانہ پن سے ان کی گرم جوشی کا جواب

دیتا ہوں۔

الماری کے آخری سرے پر صرف ایک بوتل کی جگہ خالی تھی چنانچہ میں بڑی احتیاط سے نئی بوتل وہاں لٹکا دیتا ہوں۔ الماری جو اب بوتلوں سے پر ہو چکی ہے..... اب ایک اور الماری کی ضرورت ہوگی میں خوش ہو کر سوچتا ہوں۔

